خاموش محبت

ایم الیاس

آدمی کوئی کام اس وقت انجام دیتا ہے جب اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ ایک برس قبل اسے خودکشی کی ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اس لیے اس نے بھولے سے بھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن آج اس کے لیے خودکشی ایسی ضرورت ہوگئی تھی کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ وہ کل دوسروں پر ہنستا اور ان کا مذاق اڑاتا تھا مگر آج اس پر آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی ایسا بھی نہیں تھا جو اسے روکتا، سمجھاتا کہ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ تم خود بڑے لیکچر جھاڑتے تھے کہ زندگی کو ایک جہاد سمجھو۔ جذبہ پیدا کرو جینے کا۔ یہ کیوں نہیں سوچتے ہو کہ جہاں مسائل ہیں وہاں وسائل بھی ہوتے ہیں۔ کہاں گیا وہ تمہارا فلسفۂ حیات جس پر گھنٹوں بولتے نہ تھکتے تھے۔

جب پہلی بار اسے خودکشی کا خیال آیا تھا تو وہ اک دم بھونچکا ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے حیرت ہی نہیں سخت صدمہ بھی ہوا تھا کہ ایسا خیال کیوں کر اس کے ذہن میں آیا تھا۔ جیسے گیارہ برسوں میں پیارے پیارے گیارہ بچے پیدا کرنے کے بعد بارہویں برس میں کالا کلوٹا سوکھا مریل بچہ دیکھ کر باپ کو اپنے آپ سے شرم اور بیوی پر غصہ آتا کہ اسے کیا ضرورت تھی ایسی اولاد پیدا کرنے کی۔ پھر وہ سوچتا تھا کہ اس میں بیوی کا کیا قصور ہے۔ جو بویا جاتا ہے وہی کاٹا جاتا ہے۔

مگر خیال کا راستہ کون سی دیوار، فوج، سپر پاور یا سنسر شپ روک سکتی ہے۔ خودکشی کا یہ خیال اتنا ضدی اور سرکش تھا کہ اس نے اس کے ذہن میں ڈیرا ڈال لیا۔ بدّو کے اونٹ کی طرح جس نے سر چھپانے کی جگہ مانگی تھی اور پھر وہ خیمے میں گھستا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بدّو کو اونٹ کی جگہ باہر دھرنا مارنے کے انداز سے بیٹھنا پڑا۔ کمال احمد جسے گھر والے اور عزیز واقارب چندا میاں کہتے تھے، اس خیال سے لڑنے اور اسے ذہن سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی لیکن خیال کی جڑیں پھیلتی چلی گئی تھیں اور اس کی عقل کسی بیمار مریض کی طرح کمزور اور ناتواں ہوتی گئی۔

یہ سب حالات کی سازش تھی اور حالات اس کے پیدا کردہ نہیں تھے، اس میں اتنی سکت تھی کہ ان سے مقابلہ اور زور آزمائی کرتا لیکن جو کچھ پیش آرہا تھا وہ خود بخود ہو رہا تھا۔ حالات کے ٹکسال میں بن رہا تھا کوئی بیرونی ہاتھ تھا جو اسے پوری قوت سے دھکیل کر موت کی جانب کشاں کشاں لیے جا رہا تھا اور نادیدہ سازشی عناصر اس پر زندگی کے راستے بند کرنے لگے تھے۔ اس خرابی کے اسباب میں اس کی مرضی، خود مختاری یا عقل کا ایک فیصد بھی عمل دخل نہیں تھا۔ اس فیصلے پر پہنچ جانے کے بعد کہ موت، زندگی کے سارے عذاب ختم کرسکتی ہے۔ وہ نسبتاً پرسکون ہوگیا تھا۔ عین شباب میں چاند کا غروب ہو جانا یقیناً ایک المیہ تھا مگر وہ مطمئن تھا کہ اس کے بعد بے حسی تھی... لاتعلقی اور بے خبری تھی۔ اس خود غرض دنیا میں کچھ بھی ہوا سے کیا اس کی بلا سے؟ لالہ رخ پر کیا بیتے گی اور نورین کا کیا ہوگا اس کی جانے بلا۔ وہ اتنا ہی بے فکر ہوگا جتنا قطب شمالی میں رہنے والا اسکیمو جس نے نورین کا نام سنا اور نہ ہی لالہ رخ کا۔ سارا دکھ درد، رنج والم، مایوسی اور دل شکستگی صرف احساس، آگہی اور وابستگی سے ہوتی ہے۔

اب اس کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ اس کے سامنے مرنے کے طریقے بہت تھے۔ وہ سر سے کفن باندھ کر ہاتھ میں ایک پلے کارڈ اٹھاتا جس پر فلاں "مردہ باد" لکھا ہوتا اور پھر فلاں کے جاں نثاروں کے علاقے سے گزرنے کی کوشش کرتا تو باآسانی اس جہان فانی سے گزر جاتا۔ شہادت کا اعزاز اور مقام حاصل ہوتا۔ اس منصب پر فائز ہونا اور سہل ہو جاتا اگر وہ کسی ایک فرقے کی عبادت گاہ میں جا کر انہی کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کرکے انہیں کافر قرار دے دیتا تو باقی کام خود بخود ہو جاتا مگر مرنے سے پہلے وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کوئی ایسا کام جس سے اس کی موت پر نورین اور لالہ رخ کے ابائوں کو خوشی سے بغلیں بجانے کا موقع نہ ملے بلکہ ان دونوں کے منہ پر ایک ایک جوتا پڑے۔ جوتوں کی عام سی جوڑی تو مسجد سے بھی مل جاتی ہے مگر یہ دس لاکھ کا معاملہ تھا۔ پانچ لاکھ کا ایک جوتا ایک کے منہ پر مارنا ضروری تھا۔ انہوں نے ہی کمال احمد کی زندگی کی یہ قیمت بہت سوچ سمجھ کر لگائی تھی۔ ان میں سے ایک اس کی محبوبہ کا باپ تھا اور دوسرا منگیتر کا... دونوں ہی ایک جیسے خبیث تھے اور اسے دنیا کے لیے درس عبرت بنا دینا دونوں کی زندگی کا مشترکہ نصب العین تھا حالانکہ وہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے تھے اور نہ ہی ملنا ضروری سمجھتے تھے۔

☆...☆...☆

ماں باپ اولاد کا نام رکھتے ہوئے بڑی چھان پھٹک کرتے ہیں کہ منفرد ہو، بامعنی ہو اور سعد بھی ہو مگر قسمت کے لکھے اور آنے والے وقت کا کسی کو علم نہیں ہوتا جیسے لالہ رخ کے والدین کو یہ علم نہیں تھا کہ لڑکی بڑی ہوکے 'کالا رخ' ہوگی اور جسامت ہی میں نہیں عقل میں بھی بھینس سے کم نہ ہوگی۔ ایسے ہی چندا میاں کے ابا کو اندازہ نہ تھا کہ یہ ناخلف ان کا نام روشن نہیں کرے گا، ڈبودے گا۔ وہ تو سرے سے ہی کالج کی تعلیم کے سخت خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ میٹرک کرتے ہی ان کے ساتھ مطب میں بیٹھے تو رفتہ رفتہ سارے نادر نسخے اسے بتا دیے جائیں جو حکیموں کے اس گھرانے میں دادا، پردادا کے زمانے سے سینہ بہ سینہ بڑی رازداری سے منتقل ہوتے آرہے تھے اور جو ان کی شہرت، عزت اور دولت کا اصل سرچشمہ تھے مگر ناہنجار چندا میاں کا خیال تھا کہ اب یہ سرچشمہ سوکھ چکا ہے۔ ان کی شہرت کے شرمناک نمونے شہر کی دیواروں پر نظر آتے تھے اور جو کچھ اب یہ حکیم کر رہے تھے وہ باعث عزت نہیں باعث ندامت تھا۔

لالہ رخ کا باپ بھی حکیم تھا اور بدقسمتی سے چندا میاں کا چچا بھی۔ دونوں بھائی حلیے اور وضع داری میں اس عہد کی نمائندگی کرتے تھے جب کالی سفید فلمیں بنتی تھیں۔ پھر ان بلیک اینڈ وہائٹ کے دوران ہی رنگین فلموں کا دور آیا تو ان ہیروئنوں کا دور شباب گزر چکا تھا۔ اب وہ بدصورت اور سو برس کی بڑھیا تھیں جن کی طرف کوئی بھولے سے بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ چندا میاں کے زمانے میں نیلی اور نیلی کی فلمیں مقبول تھیں۔ کیوں کہ حسن کی حشر سامانیاں رنگوں سے قیامت ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ ٹھیکرے کی منگنی دھری رہ گئی۔

چندا میاں نے پہلے تو مطب میں بیٹھ کے نسخے بنانے، دوائیں گھوٹنے اور ابالنے، جوارش اور معجون کا فرق سمجھنے اور خمیرے، کشتے کے خواص پر غور فرمانے سے صاف انکار کردیا اور پھر اس نے کالج جانے کی ضد کی۔ کیونکہ میٹرک میں وہ فرسٹ کلاس فرسٹ آیا تھا۔ وہ چند اور نمبر لے لیتا تو اس کی تصویریں اور انٹرویوز اخبارات کی زینت بن جاتے۔

چنانچہ اس کے نامزد چچا سسر نے اس کی سفارش کی اور ابا میاں نے زمانے کا چلن اور ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے اسے مشروط اجازت دی کہ وہ ڈاکٹر نہیں بنے گا کہ ایک خاندانی حکیموں کے گھر سے طب مشرق کا جنازہ اٹھے۔ ایسا ہرگز کسی قیمت پر نہیں ہوسکتا۔

چندا میاں نے ان کی کڑی شرط اس لیے مان لی کہ ڈاکٹر بننے کے لیے خاص رقم کی ضرورت تھی، ان کے ابا میاں کے لیے اس لیے مشکل تھی کہ وہ اسے برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ چندا میاں فنون لطیفہ یعنی آرٹس پڑھنے لگے مگر ستم یہ ہوا کہ بیٹ پکڑ لیا۔ دونوں بھائی فرصت کے اوقات میں شطرنج کی بساط لے کر بیٹھتے تو اس نکتے پر اتفاق کرتے تھے کہ نئی پود کو بگاڑنے میں نامور کرکٹ کے کھلاڑیوں کا کردار کسی بھی طرح ٹی وی اور ڈی وی ڈی سے کم نہیں۔ سونے پر سہاگہ کیبل جو کینسر سے کہیں خطرناک اور لاعلاج مرض کی طرح ہے۔ اس نے معاشرے کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے۔ لڑکوں سے کیا گلہ جب جوان جہان لڑکیاں ان کرکٹ کے کھلاڑیوں پر شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑتی تھیں۔ ان کی تصویریں اپنے سینے سے لگائے پھرتی تھیں اور ان کے پوسٹر دیواروں پر لگا کے ہر رات سونے سے پہلے ہی انہیں خواب میں دیکھتی رہتی تھیں۔ شرمناک بات یہ تھی کہ بچے تو بچے خود والدین بھی اس مرض میں مبتلا تھے جس نے ساری قوم کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ ون ڈے میچ ہوتا تو دنیا میں جیسے کوئی اور کام نہ ہوتا۔ کون ایسا تھا جو اس بخار میں مبتلا نظر نہ آتا ہو۔

چندا میاں کی صلاحیت کے جوہر جو پوشیدہ تھے وہ ابھر کے سامنے کیا آئے، اس نے ہر کسی کو ششدر کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چندا میاں نے حریف ٹیموں کی وکٹیں گرانا اور توڑنا شروع کردیں اور مخالف بائولرز کو چھکے مارنے شروع کیے تو تہلکہ مچ گیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی وہ دھوم مچا دے گا۔ وہ کالج کا ہیرو ہوگیا۔ رئیس زادے اسے کاروں میں فخریہ انداز سے لے کر گھومنے لگے۔ گھروں اور ہوٹلوں میں شامیں گزرنے لگیں۔ ان کی بہنیں اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہونے لگیں۔ اعلیٰ گھرانوں کی ماڈرن اور کرکٹ کی شیدائی لڑکیاں آٹو گراف کے بہانے قریب آئیں، مہربان ہوئیں اور پھر دور ہوگئیں۔ چندا میاں بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے گئے۔ ان کے معاشقوں کی یہ تیز گام بالآخر نورین کے اسٹیشن پر آکے رک گئی جو ہر اعتبار سے حسن و جمال میں یکتا تھی۔ بہترین مقررہ اور گرلز کالج میں ڈراما سوسائٹی کی روح رواں تھی اور ایک فرعون صفت پولیس کے اعلیٰ افسر کی بیٹی تھی۔ شریف لوگ لٹیروں، ڈاکوئوں اور ظالم لوگوں سے اس قدر ڈرتے اور حد درجہ خائف نہیں ہوتے جتنے ایسے اعلیٰ پولیس افسران سے جو اپنے آپ کو سیاہ و سفید کا مالک سمجھتے ہیں اور خود ہی قانون شکنی کرتے ہیں اور عدالتوں کا حکم مانتے ہیں اور نہ ان کے فیصلوں کا احترام کرتے ہیں۔

حکیم شرافت علی خان اور نجابت علی خان کو ان تمام کرتوتوں کا علم قدرے تاخیر سے ہوا۔ آتے جاتے انہوں نے چندا میاں کے ہاتھ میں بیٹ اور سفید براق قمیص پتلون کے ساتھ بلیزر کو دیکھا تو بساط کے مہروں پر غور کرتے ہوئے چھوٹے بھائی نجابت علی خان نامزد سسر نے کہا۔ "اپنے برخوردار چندا میاں بھی اس لت میں پڑگئے ہیں شرافت بھائی!"

بڑے بھائی شرافت علی خان نے آہ بھر کے اور مہرے سے نگاہ ہٹا کر ان کی طرف دیکھا اور بولے۔ "ہاں، میاں...! کس کس بات کا رونا رویا جائے اب زمانہ ہی ایسا آگیا ہے جو نہ ہو کم ہے۔"

چندا میاں کے ابا اور چچا کے لہجے میں ایسا تاسف اور ندامت کا اظہار تھا جیسے ان کے نزدیک نور چشم نے کرکٹ نہیں ہیروئن پینا شروع کردی ہو۔ اپنے مطب سے باہر ان کا تعلق بس شطرنج سے تھا۔ انہیں کیسے پتا چل سکتا تھا کہ چندا میاں کے عشق بلاخیز کا کارواں کس منزل میں ہے۔ اگر انہیں صدمہ تھا تو صرف اتنا کہ چندا میاں نے خاندانی پیشے میں دلچسپی لی ہوتی تو آج ہم کل تمہاری باری ہے کے مصداق کل شہر کی دیواریں ماہر امراض خصوصی کمال احمد کے نام سے روشن ہوتیں۔ اب تو انہیں صاف نظر آرہا تھا کہ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ جدّی پشتی شفاخانہ بھی بند ہو جائے گا۔ چندا میاں کسی بنک میں نام کے ملازم ہوں گے اور بیوی سے زیادہ وقت کرکٹ کو دیں گے جیسے کوئی شادی شدہ مرد دوسری شادی کرتا ہے تو وہ اپنی نوجوان اور جواں سال بیوی کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کرکٹ کا حسن بیوی میں کیسے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔

جب چندا میاں کی اماں نے دہائی دینی شروع کی اور ان کے سُر سے سُر ملا کے نامزد ساس نے بھی واویلا کیا۔ "اجی سنتے ہو؟"

تو حکمائے کرام فوراً متوجہ ہوئے جیسے بھونچال آگیا ہو۔ "کیا ہے بھئی...! بازی پھنسی ہوئی ہے ہر طرف سے..."

"بھاڑ میں گئی تمہاری بازی۔ اس بازی کی خبر بھی ہے کہ نہیں برخوردار کہاں پھنسا ہوا ہے؟"

"چولھے میں گئی یہ بساط... کچھ اندازہ ہے کہ بچی کا کیا حال ہے؟"

کورس میں ہونے والے دو طرفہ حملے نے برادران حکمت شرافت علی خان، نجابت علی خان کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ چندا میاں کی ماں نے پہلے شکوہ پڑھا۔ "دن رات فون آویں ہیں۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے فون کرتی ہیں۔ ایک سے ایک زبان دراز حرافہ... دیدوں میں پانی ہو تو ڈھلے... انگریزی میں جانے فر فر کیا کچھ کہہ جاتی ہیں جیسے کسی انگریز کی اولاد ہوں۔"

"تم اردو میں ڈانٹ دیا کرو۔ آج کی لڑکیاں بے شرم اور بے حیا ہیں۔ ویسے میں بھی شکایت کروں گا۔ اپنے مریضوں میں ایک ٹیلیفون کے محکمے کے افسر بھی ہیں۔ فون پر کسی کو تنگ کرنا جرم ہے۔ ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

اماں نے سر پیٹ لیا اور چند لمحوں کے بعد بولیں۔ "اجی وہ مجھے تنگ نہیں کرتیں۔ تمہارے لاڈلے چندا میاں کو پوچھتی ہیں... کہاں ہیں؟ باہر کس کے ساتھ گئے ہیں؟ اس کے ساتھ تو نہیں گئے جس کی آنکھیں نیلی ہیں اور بال سنہری ہیں اور انڈا لال ہے؟"

"انڈا؟" حکیم شرافت علی خان چونکے۔ "لاحول ولا قوۃ..."

چھوٹے بھائی نے مودبانہ لہجے میں واضح کیا۔ "غالباً کار کا حوالہ ہے۔ ہنڈا گاڑی کا۔ جس میں ایک ریٹائر افسر آتے ہیں اور جو اب تیسری شادی کر رہے ہیں۔"

شرافت نے سر ہلا دیا۔ "اچھا... اچھا... میں سمجھا۔ لال ہنڈا... خیر تو پھر آپ نے کیا کیا بیگم...؟"

بیگم نے اسی انداز سے فریاد کی جیسے شاہی دربار میں بادشاہ سلامت کے آگے کھڑی ہوں۔ "میں کیا کہتی؟ وہ تو مجھے بری طرح ڈانٹ رہی تھی جیسے میں اس کی نوکرانی ہوں... اس نے تحکمانہ لہجے میں

کہا کہ وہ آئیں تو کہہ دینا روزی نے فون کیا تھا؟''

''یہ روزی کون ہے؟ ایک روزی تو اللہ میاں کے ہاتھ میں ہے۔''

''اجی! مجھے کیا پتا؟ کبھی روزی، کبھی شاہینہ، کبھی عفت تو کبھی نادیہ... وہ بدذات کہنے لگی دیکھو خادمہ، میں انعام دوں گی تمہیں... وہ جیسے ہی گھر آئیں مجھے فون کر دینا۔ نمبر لکھ لو میرا۔ میں نے وہ بے نقط سنائیں کہ اس کی نیندیں اڑ جائیں گی۔''

شرافت علی خان کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے اور پھر پوچھا۔ ''بیگم... کہیں ایک ہی لڑکی تو نہیں جو نام بدل بدل کر فون کرتی رہتی ہو؟''

بیگم نے جواب میں فون نمبروں کی ایک فہرست نکال کر ان کے سامنے رکھ دی اور بولیں۔ ''لو... تم خود ہی دیکھ لو بلکہ ان سب کے ابائوں سے بات کر لو اور اپنا ٹیلیفون کا بل بھی دیکھ لو۔ یہ سات سو بیس فون آخر کس نے کیے اور کسے؟ دن رات گھنٹی بجتی رہتی ہے۔ میرے تو سوتے میں بھی کان بجتے ہیں۔''

شکوہ کے بعد جواب شکوہ کے طور پر چندا میاں کی نامزد ساس نے اپنا دکھڑا سنایا۔ ''آخر ٹھیکرے کی منگنی ہے۔ سبھی کو پتا ہے۔ کب تک کسی ناسور کی طرح بچی کو لیے بیٹھے رہیں گے؟''

نجابت علی خان نے اسے جیسے دلاسا دیتے اور سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بیگم... تم ناحق پریشان ہو رہی ہو؟ یہ تو گھر کی بات ہے۔''

''اے لو... گھر کی بات ہے تو کیا اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دنیا کیا کہہ رہی ہو گی؟ آخر رخصتی کیوں نہیں ہو پا رہی ہے... اگر یہ منگنی نہ ہوتی تو نہ جانے کتنے رشتے آتے، ایک سے ایک اچھے...''

''لو بھائی...! اب میرا منہ مت کھلوائو۔ میرے چاند جیسا بیٹا کون ہے اس شہر میں!''

''اور میری لالہ رخ... چاند کا ٹکڑا ہے وہ بھی...''

''بس۔ اس سے آگے کچھ مت کہنا۔'' بڑے بھائی نے ریفری کی طرح سیٹی بجا کے رائونڈ شروع ہوتے ہی روک دیا۔ ''ہم آج ہی بات کر لیں گے۔''

نجابت علی خان نے اطمینان کی سانس لے کر نظر بساط پر ڈالی اور کہا۔ ''چلیے، بھائی جان۔ شہ مات ہو رہی ہے آپ کو... ادھر گھوڑا ہے ادھر فیل۔'' یہ بات انہوں نے اپنی بیوی اور بھاوج کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی مگر ان کا مدعا ہرگز ایک کو گھوڑا اور دوسرے کو ہاتھی کہنے کا نہیں تھا۔ وہ خود ہی برا مان کے اٹھ گئیں۔

اسی شام حکیم شرافت علی خان نے چندا میاں کو گھیر لیا۔ ''بیٹھو... ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

چندا میاں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''اس وقت... آدھی رات کو؟ خیریت تو ہے؟''

ابا نے ناگواری سے کہا۔ ''یہ تمہیں سوچنا چاہیے کہ آدھی رات کیوں ہوئی؟ تم ہر روز اسی وقت آتے ہو۔''

''میرا مطلب تھا کہ صبح کو...'' چندا میاں نے گڑبڑا کر کہا۔

''کیا تمہاری صبح بھی ہوتی ہے قبل از ظہر... جب ہم مطب میں آدھے مریض دیکھ چکے ہوتے ہیں۔'' شرافت علی خان نے سختی سے کہا۔ ''اور یہ کیا جگالی کر رہے ہو؟ آداب گفتگو کے خلاف ہے اس طرح کی حرکت!''

''یہ چیونگم ہے ابا جی۔'' وہ مجبوراً بیٹھ گیا۔

''آج کل جو کچھ ہم سن رہے ہیں تمہارے بارے میں...'' انہوں نے تمہید باندھی۔

چندا میاں نے چہک کر مودبانہ انداز میں کہا۔ ''ابا جی... ابھی پچھلے میچ میں میں نے دس اوورز میں چھ وکٹیں لیں۔ سب کلین بولڈ... رن صرف اٹھائیس۔ سیمی فائنل تھا۔''

''لاحول ولا قوۃ... میاں ہم اس وبائی مرض کی بات نہیں کر رہے جسے کرکٹ کہتے ہیں۔ اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔'' شرافت علی خان نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ ''عملی زندگی کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے تم نے...؟''

''سوچنے کی کیا ضرورت ہے ابا جی! عملی زندگی ہی تو گزار رہا ہوں۔ نظریاتی ریسرچ تو نہیں کر رہا۔''

''بی اے کا نتیجہ کب آ رہا ہے تمہارا...؟''

چندا میاں نے شانے اچکائے۔ ''اللہ بہتر جانتا ہے۔''

''جانتے تو ہم بھی بہت کچھ ہیں مگر اس وقت لمبی بات کرنا نہیں چاہتے۔ یہ بتائو کہ بی اے کے بعد کیا ارادہ ہے؟''

''ایم اے کرنے کا... ویسے ایک بنک نے بہت اچھی آفر کی ہے۔ یعنی ڈائریکٹ اے وی پی۔''

''یہ وی پی پی تو سنا تھا... ڈاک خانے والوں کا طریقہ ہے نقد لے کر چیز دینے کا۔ مگر یہ اے وی پی کیا ہوتا ہے؟''

چندا میاں ہنس پڑے۔ ''یہ عہدہ ہوتا ہے ابا جی بنک میں۔ اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ کا۔ اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ ساتھ میں مراعات بھی، کام کچھ نہیں۔ بس ٹورنامنٹ میں بنک کی طرف سے کھیلنا ہے۔''

''عجیب زمانہ آ گیا ہے۔ بنکوں میں کھیل ہوتا ہے۔ غبن ہوتا ہے۔ بڑی بڑی رقومات کے قرضے معاف ہوتے ہیں۔ دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ لٹیرے گاڑیوں میں آتے ہیں اور مسلح گارڈ کو بے بس کر کے لاکھوں اور کروڑوں لے جاتے ہیں۔ بعض تو بغیر گاڑی کے آتے ہیں اور ڈاکا مار کے پیدل ہی فرار ہو جاتے ہیں۔ ہماری مراد کچھ اور تھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم یہ بنک کی ملازمت قبول کر لو تاکہ ہم بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہوں۔'' انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''کون سا فرض ابا جی؟''

''یہی تمہاری خانہ آبادی کا... ہم تمہاری عمر کو پہنچے تھے تو چار بچوں کے باپ بن گئے تھے۔ نکاح میں بے سبب تاخیر یقیناً مناسب نہیں۔ اب تو ہم خود کو مجرم سمجھنے لگے ہیں۔ اس لیے کہ لالہ رخ ہمارے چھوٹے بھائی کی بیٹی ہے۔''

چندا میاں نے اتنی دیر میں فیصلہ کر لیا تھا کہ آج کی بات کو کل پر نہ ٹالا جائے۔ وہ فوراً بولے۔ ''ابا حضور۔ میں شادی کے لیے تیار ہوں مگر شادی اس موٹی کالی بھینس سے نہیں کر سکتا جس کا نام غلطی سے لالہ رخ رکھ دیا گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ساری عمر میں بین بجاتا رہوں اور وہ سر ہلاتی رہے۔ اسے کیا معلوم کہ کرکٹ کیا ہوتی ہے اور سوشل ایٹی کیٹس کسے کہتے ہیں۔ خود میں اس کے گلے کا ڈھول نہیں بننا چاہتا جسے وہ ساری عمر بجانے پر مجبور ہو۔ یہ ٹھیکرے کی منگنی ایک جاہلانہ رسم تھی۔ آپ کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ میرے ساتھ لالہ رخ کو بھی جہنم میں جھونک دیں۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ ایسے کنبے سے باز آیا۔ میں شادی کروں گا تو نورین سے۔''

صدمے سے حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث اس رات شرافت علی خان مرحوم و مغفور ہوئے اور حکیموں کے اس خاندان کا شیرازہ چہلم سے پہلے ہی بکھر گیا۔ نجابت علی خان نے ایک رات شب خون مارا۔ انہوں نے تمام قیمتی دوائوں کے مرتبان اور ڈبے اٹھانے کے بعد مطب پر بورڈ لگا دیا۔ ''حکیم شرافت علی خان کا شفاخانہ متصل گلی میں ہے۔''

ضرورت مندوں کی مزید رہنمائی کے لیے انہوں نے گلی کے موڑ پر تیر کے نشان والا بورڈ بھی لگوا دیا۔ انہیں اندازہ تھا کہ سارے رشتے ختم ہوئے۔ اب مقدمے بازی ہو گی۔ مطب کی عمارت بہ حکم عدالت سربمہر ہو جائے گی لیکن دوا کے طلب گار حسب سابق جوق در جوق آتے رہیں گے۔ حکیم شرافت علی خان کے بیمار اب حکیم نجابت علی خان سے رجوع کریں گے۔ آخر شرافت اور نجابت میں فرق ہی کیا ہے۔

یہ بات آج بہت کم لوگ جانتے ہیں اور پہلے بالکل نہیں جانتے تھے کہ چچا، تایا، خالہ یا ماموں کی اولادیں آپس میں مسلسل شادیاں کرتی رہیں تو اس کے کتنے سنگین نتائج نکلتے ہیں۔ بے اولادی تو بہت ہی معمولی سزا ہے۔ معذور اور اپاہج اولاد کا سبب بھی ایسی شادیاں ہوتی ہیں۔ بچوں میں خون کا کینسر بھی ممکن ہے۔ اولاد کا پیدا ہونے سے پہلے مر جانا یا قبل از وقت ولادت کے باعث بے حد کمزور ہونا اور معمولی امراض کا شکار ہو کے وفات پانا، یہ سب آپس کی شادیوں کی وہ خرابی ہے جو رفتہ رفتہ میڈیکل سائنس کی ریسرچ کے نتیجے میں سامنے آ چکی ہے۔

شرافت علی خان اور نجابت علی کی بیویاں بھی ان کی فرسٹ کزن تھیں۔ نتیجہ یہ کہ شرافت کی نشانی صرف چندا میاں بچے تھے اور نجابت کی وارث ایک لالہ رخ تھی۔ اب چندا میاں غیر ہو گئے تو نجابت علی خان کی نظر بھی غیروں کی طرف گئی اور بالآخر انہوں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ وہ شفاخانے کے قدیم نسخہ ساز یعنی کمپائونڈر کو اپنی جانشینی کی تربیت دیں گے اور اگر حالات موافق ہوئے تو لالہ رخ کو مطب سمیت اس کے حوالے کر دیں گے لیکن یہ بات انہوں نے اپنی ذات تک محدود رکھی۔

چندا میاں کے گھر سے چہلم کی چاندنی سمیٹی گئی تو انہوں نے آبائی مکان اور شفاخانے کی ملکیت کا کیس دیوانی عدالت میں دائر کر دیا اور خود اپنی ماں کے ساتھ ایک فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔ بنک کی ملازمت کے لیے پروانہ انہیں پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا۔ نئی جگہ پہنچتے ہی انہوں نے اماں کو سختی سے تاکید کی کہ آئندہ وہ کسی کے سامنے غلطی سے چندا میاں نہ کہیں۔ دنیا اسے کمال احمد کے نام سے جانتی ہے تو بس یہی نام چلے گا۔

باپ کی موت کا دکھ اسے ضرور تھا مگر ساتھ ہی خوشی بھی تھی کہ وہ اپنے ماضی کے اس جال سے نکل آیا جو کسی تاریک سنسان کھنڈر میں صدیوں پرانے مکڑی کے جالوں سے زیادہ بوسیدہ تھا۔ اچانک خاندانی حکمت کا باب بند ہو گیا تھا۔ حکیم شرافت علی خان کا بیٹا ایک کرکٹر اور بنک میں اے وی پی تھا۔ اب وہ چندا میاں نہیں کمال احمد تھا۔ وہ کسی لالہ رخ کا منگیتر نہیں تھا۔ ایک پرانی حویلی جیسی عمارت کے اندھیرے کمروں کی پرآسیب فضا سے نکل کے وہ شہر کے پوش علاقے میں پہنچ گیا تھا۔

کمال احمد کو بنک سے لون پر گاڑی مل گئی۔ اس نے فلیٹ کو جدید طریقے سے آراستہ کیا۔ کیبل کے باوجود ڈش اینٹینا کے ساتھ ٹی وی اور وی سی آر اور ڈی وی ڈی بھی تھے۔ نیا فریج، ڈیپ فریزر، نئے صوفے، نئے قالین، نئی ڈائننگ ٹیبل اور اے سی... پرانی چیز یہاں صرف ایک آئی تھی۔ حکیم شرافت علی خان کی بیوہ... وہ خود کو اس نئی دنیا میں بالکل اجنبی اور تنہا محسوس کرتی تھی اور سارا دن گم صم، چپ چاپ اپنے آراستہ بیڈ روم میں پڑی چھت کو گھورتی رہتی تھی۔ جہاں شاید ماضی کی یادیں فلم کی طرح نظر آتی تھیں۔ وہ چھت اس کے لیے سنیما اسکرین تھی۔ اس کے مرنے کا بھی کسی کو پتا نہیں چلا۔ گھر میں کام کرنے والی ماسی جب اس کے لیے ناشتا لے کر گئی تو وہ سیدھی لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ مر کے بھی اس کی آنکھیں وہیں مرکوز تھیں جہاں چھت کی سفید اسکرین اب خالی پڑی تھی۔ فلم ختم ہو چکی تھی۔

کمال احمد دنیا میں اب اکیلا تھا۔ نورین کئی بار اس کی ماں کی زندگی میں اس کے فلیٹ پر آ چکی تھی لیکن اس کی ماں کو کسی کے آنے سے سروکار تھا نہ جانے سے۔ وہ اپنی سدھ بدھ بھلا بیٹھی تھیں۔

''اب تم ہی بتائو کہ میں اس حالت میں ماں کو ساتھ لے کر کیسے تمہارے گھر آئوں؟'' کمال نے کہا تھا۔

"واقعی یہ تو بڑا مسئلہ ہے؟" نورین متفکر اور پریشان سی ہو گئی تھی۔

"ہاں۔ مسئلہ تو ہے۔ ماں کسی سے بات ہی نہیں کرتی۔ تمہارے خوں خوار باپ کے سامنے کیا بولے گی۔"

"تم نے انہیں پھر بلڈاگ کہا۔" وہ بگڑ کر اسے گھورنے لگی۔

"میں نے خوں خوار کہا ہے۔ بلڈاگ بھی خوں خوار ہوتا ہے مگر تمہیں اعتراض تھا اس لیے میں نے ایسا کہنا چھوڑ دیا۔"

"تم بہت بد معاش ہو۔" نورین نے اسے پیار بھری خفگی سے دیکھا۔

"بد معاش اور بد معاشی کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ اس لیے ختم نہیں ہو سکتا۔"

نورین نے اسے جھڑک دیا۔ "میں فلرٹ نہیں کرتی... سمجھے۔ میرے ساتھ شرافت سے رہو۔"

"تم عجیب لڑکی ہو۔" کمال نے خفت سے کہا۔

"ہاں۔ مجھ سے پہلے شاید غریب لڑکیاں ہوں گی۔ اب یہ کھیل ختم۔ ورنہ..."

"ورنہ کیا... ڈیڈی سے کہہ کر گولی مروا دو گی؟"

"خود گولی مار دوں گی ابا کے ریوالور سے..." اس نے کمال کے سینے پر انگلی عین دل کی جگہ پر رکھی۔

"ہو نا خوں خوار باپ کی خوں آشام بیٹی۔"

"تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو ڈیڈی سے... تم کوئی مجرم ہو...؟"

"بابا۔ وہ جسے چاہیں چٹکی بجا کے مجرم بنا دیں اور میرا یہ جرم کیا کم سنگین ہے جس کا نام نورین کی محبت ہے۔ یہ بتاؤ کبھی تم نے اپنے ڈیڈی سے بات کی؟"

"پاگل ہو گئے ہو؟ میں بات کروں گی ڈیڈی سے...؟"

"اچھا اپنی سویٹ ممی سے...؟"

نورین نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ ایسا فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں ہوتا ہے۔ ہمارے گھروں میں نہیں۔"

"انہیں معلوم تو ہو گا؟" کمال نے کہا۔ "عشق اور مشک چھپتا نہیں۔ اس کی خوشبو کسی پرفیوم سے زیادہ تیز اور مہینوں تک رہتی ہے۔"

"تم معلوم کر لو۔" نورین شرارت سے ہنسی۔ پھر شوخی سے بولی۔ "جمعے کی صبح ڈیڈی بڑے خوشگوار موڈ میں ہوتے ہیں۔ ویسے وہ جانتے ہیں تمہیں، بہت اچھی طرح سے..." اس نے اپنی خوبصورت لمبی پلکیں جھپکائیں۔

"پسند بھی کرتے ہیں یا نہیں؟" کمال نے پوچھا۔

"وہ ہاکی کھیلتے تھے۔ کرکٹ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کا بس چلے تو یہ کھیل ہی ممنوع قرار دے دیں۔"

"ہاں۔ مجھے اس کا اندازہ ہے کہ ان کے دل میں کرکٹ کے خلاف کتنا زہر بھرا ہوا ہے۔"

"تمہیں اس بات کا اندازہ کیسے ہوا تھا؟"

"میں ایک بار گیا تھا ان کے پاس کہ انہیں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا جائے۔ انہوں نے سب کے سامنے کرکٹ کو وقت ضائع کرنے کا سب سے موثر طریقہ قرار دیا۔ حساب لگا کے بتایا کہ ایک ون ڈے انٹرنیشنل ہو تو قوم کے کتنے کام کے گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں۔ قومی آمدنی کا کتنا نقصان ہوتا ہے۔ وہ یہ کہے بغیر بھی انکار کر سکتے تھے۔ مجھے سخت غصہ آیا اور پھر میں چلا گیا ان کے ڈی آئی جی کے پاس... وہ بڑے خوش ہوئے فوراً مہمان خصوصی بننا قبول کر لیا اور انعام دینے کے لیے آئے تو تمہارے ڈیڈی ایس پی صاحب کے ساتھ۔"

"تم نے کہا ہو گا؟"

"ہاں۔ درخواست کی تھی کہ انہیں ضرور ساتھ لائیں۔ تمہارے ڈیڈی کا موڈ بہت ہی خراب تھا۔" کمال قہقہہ مار کے ہنسا۔ "اس دن پتا چلا کہ ایس پی بھی نوکر ہی ہوتا ہے۔"

"اے وی پی کیا نوکر نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہے۔ جورو کا غلام ہوتا ہے۔ زر خرید نوکر ہوتا ہے، الو ہوتا ہے اور کچھ..." کمال احمد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

دو جمعے سوچنے اور ہمت کرنے میں گزر گئے۔ اس سے اگلے دو جمعے ایس پی صاحب مصروف رہے۔ نورین اسے مسلسل غیرت دلاتی رہی۔ بالآخر ایک دن وہ سر پر کفن باندھ کے ان کے بنگلے پر پہنچ گیا۔

ایس پی عبدالخالق کی خامی جسے وہ خوبی شمار کرتا تھا یہ تھی کہ وہ ڈائریکٹ پولیس سروس میں نہیں آیا تھا۔ اے ایس پی کی حیثیت سے آنے والے نوجوان لوگ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانوں کے ہوتے تھے اور ان میں روایتی پولیس والوں جیسی بے حسی، سختی یا سفاکی نہیں نظر آتی تھی جو نیچے سے کانسٹیبل بھرتی ہو کے عمر کے آخری دور میں ایس پی بننے والوں میں تجربے سے آ جاتی تھی۔ وہ تجربہ جو تیس برس مجرموں کو پکڑنے اور ان سے تفتیش کرنے اور اقبال جرم کرانے اور تھانوں میں دن رات گزارنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایس پی عبدالخالق ایسے افسروں کو افسر ہی نہیں مانتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ "لو جی... جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے کالج چھوڑے، پولیس سروس کا امتحان دیا اور بی اے پاس لڑکا آ کے ہمارے اوپر بیٹھ گیا جسے خاک پتا نہیں کہ تھانہ کیا ہوتا ہے اور تفتیش کس چڑیا کا نام ہے۔ دو چار برس میں وہ بن جاتا ہے ڈی ایس پی اور پھر ایس پی... کام کرتے ہیں بس نیچے والے، ہم جیسے گدھے جو رینگ رینگ کر منت سفارش سے تیس پینتیس برس میں ایس پی بنتے ہیں وہ بھی تقدیر ساتھ دے تو ورنہ ڈی ایس پر ریٹائر۔" عبدالخالق کچھ دیر خاموش رہ کر کمال احمد کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے کارڈ پر نظر ڈال کر بولا۔ "گویا اے وی پی ہو۔ اور کرتے کیا ہو؟"

"جی... وہی جو بنک میں ہوتا ہے۔" کمال نے بوکھلا کر کہا۔

"جھوٹ۔ بکواس۔ تم جیسے بہت ہیں جو بنکوں میں بڑے بڑے عہدے پر بیٹھے ہیں مگر کام ایک پیسے کا نہیں کرتے۔ بس کرکٹ کھیلتے ہیں اور قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ ہماری ایئر لائن کا بیڑہ غرق کیوں ہوا آخر؟"

وہ چونک پڑا۔ "کب؟ کل صبح تو میں گیا تھا ایئرپورٹ... سب ٹھیک ٹھاک تھا۔"

"خاک ٹھیک تھا۔ بنکوں کا کیا حشر کر دیا تم لوگوں نے؟"

"جب لوگ قرضے واپس نہیں کریں گے اور معاف کرا لیں گے تو پھر یہی ہوتا ہے۔" کمال نے میز پر ہاتھ مارا تو چوٹ کراری پڑی تھی۔ وہ ہاتھ سہلانے لگا۔

"او یار! معاف کرنے والے بھی تم ہی ہو اور قرضہ منظور بھی تم ہی کرتے ہو۔ تمہارا پریذیڈنٹ کیا انکار نہیں کر سکتا... نہ معاف کرے قرضہ۔"

"اچھا جی... میں کسی کو معاف نہیں کروں گا۔ اگر میں کبھی پریذیڈنٹ بنا۔"

"وہ وقت کب آئے گا۔ اس وقت تک بنک کہاں رہے گا۔" خالق نے گویا ایک پوائنٹ اسکور کیا۔ "سب کھا پی کے بھاگ جائیں گے۔"

"چلیں۔ میں آپ کو ایک فہرست بنا دوں گا نادہندگان کی۔ پولیس سب کو پکڑ لے گی۔"

"کیا اس وقت تک میں پولیس میں رہوں گا؟"

بحث غلط رخ اختیار کر گئی تھی اور غلط موڑ پر آ گئی تھی۔ کمال بحث کرنے نہیں آیا تھا ورنہ ایس پی عبدالخالق کے چھکے چھڑا دیتا۔ اسے کلین بولڈ کرنا بہت آسان تھا۔ اس کی ساری زندگی رشوت کھاتے گزری تھی۔ کمال کو معلوم تھا کہ اس کے اثاثے کتنے ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ اس نے اپنی کالی دولت کس کے نام پر چھپا رکھی ہے؟ کمال نے یہ معلومات خاصی کوشش اور بڑی محنت سے اکٹھا کی تھیں۔ دشمن کے قلعے میں گھسنے سے پہلے اس کی کمزوری کا علم تو ہونا چاہیے نا۔ مشکل یہ تھی کہ مقطع میں آ پڑی تھی، سخن گسترانہ بات اور قطع محبت اسے کسی صورت مقصود نہ تھا۔ ایک شیشے کے پیچھے سے نورین نے کئی بار آنکھیں نکالیں اور اسے اشاروں سے سمجھانے کی کوشش کی وہ فضول باتوں میں نہ پڑے اور اپنے مطلب کی بات کرے مگر ماحول سازگار ہوئے بغیر کمال کو بات کرنی مشکل تھی۔ اسے یقین تھا کہ بات بننے سے پہلے ہی بگڑ جائے گی۔

جب وہ چائے پی کر اٹھا تو ایس پی عبدالخالق نے کہا۔ "یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیوں آئے تھے؟"

"جی... بس... پھر کبھی عرض کروں گا۔" اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"کسی کو اندر کرانا ہے۔ کوئی مکان خالی کرانا ہے۔ چکر کیا ہے آخر؟"

"نہیں جی... چکر کوئی نہیں ہے۔" وہ مودبانہ انداز میں بولا۔

وہ باہر تک اس کے ساتھ آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "چکر تو ہے برخوردار... ہم نے بھی یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔"

کمال نے اس کے گنجے چمکدار سر کی طرف عمداً نہیں دیکھا۔ نظریں جھکا کے کھڑا رہا۔

"تم شادی کرنا چاہتے ہو نا نورین سے...؟"

کمال کلین بولڈ ہو گیا۔ "آپ جانتے ہیں؟"

"پولیس والے مجرم کا چہرہ پڑھنا جانتے ہیں اور تمہارے جرم کی مخبری تو بہت پہلے ہو گئی تھی۔ مجھے انتظار تھا کہ تم خود کب اعتراف کرتے ہو؟"

کمال نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا۔ "پھر... جناب؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں... بس ایک شرط ہے میری!" جواب ملا۔

کمال کا چہرہ لٹک گیا۔ "وہ کیا جی...؟"

"دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو... نورین یا کرکٹ کا؟"

کمال بھونچکارہ گیا۔ ”یہ آپ... کیا فرمارہے ہیں؟“

”ٹھیک فرمارہا ہوں۔ جو کچھ آج تم کمارہے ہو، اے وی پی صاحب! یہ صرف کرکٹ کی کمائی ہے۔ تمہاری نہیں۔ پہلے خود کچھ کمانے کے قابل ہو جاؤ پھر آنا۔ سمجھے...؟ اپنی بیٹی کسی ایسے شخص کے حوالے کیسے کردوں جو کرکٹ نہ کھیلے تو فاقے کرے میری بیٹی!“

”لیکن... کرکٹ میں کیوں نہ کھیلوں آخر...؟“

”کیا کوئی ضمانت دی ہے بنک والوں نے...؟“

”میرا کھیل ہی میری سب سے بڑی ضمانت ہے۔“ اس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں اس وقت بڑے فارم میں ہوں اور اسے قائم کیے ہوئے ہوں۔“

”ٹھیک کہا تم نے... فرض کرو تم سے اچھا کھلاڑی مل گیا انہیں... گو کہ میں اس کے اسرار ورموز زیادہ نہیں سمجھتا۔ اخبار میں جو کچھ پڑھتا اور ٹی وی میں جو کھیل پر تبصرہ ہوتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی کھلاڑی دو چار میچ خراب کھیلے۔ باؤلر وکٹ نہ لے یا بیٹسمین کوئی اسکور نہ کرسکے۔ پہلی ہی گیند پر آؤٹ ہوتا رہے تو اس کی پوزیشن کمزور ہو جاتی ہے۔“

”یہ وقتی بات ہوتی ہے۔“ اس نے دفاع کیا۔ ”دنیا کے ہر کھلاڑی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ ہوتا رہتا ہے۔“

”ہاں... مگر یہاں سب بے صبرے ہیں۔ اچھے وقت میں واہ واہ بھی بہت کرتے ہیں۔ برا وقت آجائے تو فوراً آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔“

”جسے آپ برا وقت کہہ رہے ہیں وہ ہر کسی کھلاڑی پر آتا ہے۔“

”دیکھو۔ میں بحث نہیں کرتا۔ منفی سیاست کہاں نہیں ہے؟ اس نے ہاکی اور فٹ بال کا بیڑہ غرق کردیا۔ کرکٹ میں تمہارے بورڈ کے چیئرمین کو کسی نے نہیں بخشا۔ بورڈ والے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔ کئی نامور کھلاڑیوں کے ساتھ کیا ہوا۔“

”میرا اس سے کیا تعلق؟“ اس نے ساکت نظروں سے دیکھا۔

”آج نہیں تو کل ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ جیسی روح ویسے فرشتے... جیسی یہ قوم ہے اپنے کردار اور مزاج میں، ویسے ہی کھلاڑی بھی ہوتے جارہے ہیں۔ ماشاء اللہ ان کے کارہائے نمایاں کی داستانیں آج کل بہت سننے میں آرہی ہیں۔ ویسٹ انڈیز میں کیا ہوا تھا؟ شارجہ میں سٹے بازوں کا کیا معاملہ تھا؟ بال ٹمپرنگ کا چکر کس نے چلایا تھا؟ سری لنکا میں شکست کیوں ہوئی؟ یہ سب کرکٹ ہی میں کیوں ہو رہا ہے اور ہمارے ملک کے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟“

”یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے گوروں کی۔“ اس نے جواب دیا۔

”جان بچانے کے لیے سب سے آسان نسخہ کیا ہوتا ہے برخوردار! الزام دشمن پر ڈال دو۔“

”میں سمجھا نہیں کہ آخر میری شادی کے مسئلے سے ان باتوں کا کیا تعلق ہے؟“ کمال کا حوصلہ جواب دے گیا۔

”ہے۔ اگر تم سمجھو اور سنجیدگی سے سوچو۔ فرض کرو کہ بنک کا صدر تم سے کسی بات پر خفا ہو جاتا ہے۔ قصور تمہارا صرف یہ ہو کہ تم نے ایک غلط اسٹروک کھیلا اور غلطی سے بولڈ ہو گئے۔ یہ غلطی اس لیے بھی سرزد ہو جاتی ہے کہ اسکرین پر جو لڑکیاں بھڑکیلے لباسوں اور بے حجابی کے انداز میں نظر آتی ہیں تو ایسا بھڑکیلا حسن دیکھ کر نگاہیں چوک جاتی ہیں۔ بجائے گیند کے وہ نظروں میں سما جاتی ہیں اور اگر اس وجہ سے بنک نے تم کو نکال دیا کہ تم بولڈ ہو گئے، ٹورنامنٹ ہار گئے۔ صدر جانتا ہے کہ تم اس کے ملازم ہو اور تمہیں صرف کرکٹ کھیلنے کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ تم مجبور ہو اس کے سامنے...“

”یہ غلط ہے کہ کھلاڑی مجبور ہے۔“ اس کا لہجہ تکرار کا سا تھا۔

”وہ کسی دوسرے بنک یا ادارے سے کھلاڑی لے سکتا ہے؟“

”میں بھی تو جا سکتا ہوں دوسرے بنک یا ادارے میں... بنکوں کی کوئی کمی نہیں ہے؟“

”اگر کل خدانخواستہ باؤنسر لگنے سے تمہاری ایک آنکھ ضائع ہو جائے یا کسی جسمانی معذوری کے سبب تم بیٹ نہ پکڑ سکو... پھر کیا ہوگا؟ تم نے کبھی اس پہلو پر بھی سوچا یا محض خوابوں میں ہی گم رہتے ہو؟“

”یہ سب مفروضات ہیں میں ان پر بات نہیں کرسکتا۔“

”میں امکانات کو سامنے رکھتا ہوں۔ اس لیے میں ایک حقیقت پسند اور دوراندیش شخص ہوں۔ تمہاری ذاتی صلاحیت صفر ہے۔ تم ایک عام بی اے پاس نوجوان ہو۔ تمہارے ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں ہے اور تمہاری اس ملازمت کو کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ عام سرکاری ملازم عدالت میں جا سکتا ہے لیکن تم نہیں جا سکتے۔ مجھے بتاؤ تم عدالت سے یہ حق کیسے مانگ سکتے ہو کہ میں اچھی کرکٹ کھیلتا ہوں اس لیے مجھے عہدے سے نہ ہٹایا جائے۔“

اوپر کی کھڑکی سے نورین نے جھانک کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ معلوم نہیں اس نے کیسے سمجھ لیا تھا کہ گیٹ پر بحث چل رہی ہے اور ٹی وی پر ہونے والے کسی مذاکرے کا سا گمان ہو رہا ہے۔ شاید وہ اپنے باپ کی عادت سے اچھی طرح واقف تھی۔

کمال نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر خون کے گھونٹ پی کر تحمل سے کہا۔ ”یعنی آپ کا فیصلہ اٹل ہے... میں کرکٹ چھوڑ دوں یا نورین کا خیال؟“

”نہیں... میں کرکٹ کو شادی کے لیے کوالیفکیشن نہیں سمجھتا۔“

”پلیز! یہ بھی بتادیں کہ کرکٹ چھوڑ کے میں کیا کروں؟“

”کچھ بھی کرو۔ بس ثابت کرو کہ تم کرکٹ کے بغیر بھی کما کھا سکتے ہو۔ ایک شوہر کی حیثیت سے اپنی ذمے داری نبھا سکتے ہو اور زندگی میں کامیاب بھی ہو سکتے ہو۔“

”کامیابی کے لیے آپ کا کیا معیار ہے؟ ہزار گز کی کوٹھی، دس لاکھ کا بنک بیلنس... دس گز کی کار؟“

”نہیں۔ اوسط درجے کا گھر... تیس چالیس ہزار کی ماہانہ آمدنی... کار اور بینک بیلنس کی کوئی شرط نہیں، موٹر سائیکل ہو ورنہ یہ چیزیں بعد میں آجاتی ہیں اگر آدمی میں ترقی کرنے کی لگن ہو۔“

”ناجائز آمدنی ہو تو ایک چپراسی بھی بہت کچھ بنا لیتا ہے۔“

”ناجائز آمدنی بھی ناجائز اسلحے کی طرح ہوتی ہے برخوردار! اسے چھپانا اور استعمال کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ہمت اور ذہانت چاہیے۔“

”بے ضمیری اور بے غیرتی کے علاوہ چور ڈاکو اس معیار پر سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔“

”ذرا غور سے دیکھو، اپنے چاروں طرف اور مجھے بتاؤ کہ یہاں چور ڈاکو کون نہیں ہے۔ فرق صرف چھوٹے بڑے کا ہے۔ چھوٹا چور بے غیرت کہلاتا ہے، بڑے کی شان بڑی ہے۔ چور وہ کہلاتا ہے جو پکڑا جاتا ہے۔ ٹیکس چوروں، قرض نادہندگان اور سرکاری واجبات ادا نہ کرنے والوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ بل ادا نہ کرنے پر فون بند ہوتا ہے صرف اس کا جو چھوٹے گھر میں رہتا ہے اور چھوٹا آدمی کہلاتا ہے۔ جن کے ذمے لاکھوں کے واجبات ہیں ان کا فون کون کاٹ سکتا ہے۔ ہاؤس بلڈنگ والے بیوہ کا گھر نیلام کرسکتے ہیں لیکن کسی بڑے کی جائداد ضبط نہیں کرسکتے۔ خود اینٹی کرپشن والے بدعنوان ہیں۔ جاؤ میری بات پر غور کرو۔ جلدی کا معاملہ نہیں ہے۔ ہم نے پولیس کی نوکری میں تیس برس گزارے ہیں دنیا دیکھی ہے برخوردار! تم نے ابھی کیا دیکھا ہے... بیٹ اور بلے کے سوا؟“

”میری عمر میں آپ نے کیا دیکھا تھا؟“ کمال اب بحث پر آمادہ تھا۔ ”کیا تھا آپ کے پاس؟ آپ کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا تھا؟“

”ہم زمیندار تھے اور زمین بے وفا ہوتی ہے اور نہ اس کی کمائی ناجائز۔ میں ذاتیات کو بیچ میں نہیں لانا چاہتا۔ تمہارے باپ دادا حکیم تھے۔ سارا شہر جانتا ہے کہ ان کی حکمت کس قسم کی تھی؟ آج تمہارا چچا جو پوشیدہ پیچیدہ امراض کے علاج سے لوگوں کو لوٹ رہا ہے وہ کتنا نیک نام ہے۔ تمہاری اس سے مقدمے بازی چل رہی ہے۔ اگر تمہاری خاندانی حویلی بیس، پچیس برس بعد تمہیں ملی تو کھنڈر ہو گی۔“

”اس کے باوجود اس زمین کی ملکیت ایک کروڑ ہو گی اس وقت...“

”تمہاری شادی تو آج کا مسئلہ ہے۔“ وہ بہت ہوشیار ثابت ہو رہا تھا۔

”لیکن آج میں ایک کامیاب کرکٹر ہوں؟ سپر اسٹار...“

”ایک پہلو اور بھی ہے اس معاملے کا... یہ کھلاڑی اپنی بیویوں سے زیادہ کھیل کو وقت دیتے ہیں۔ بیویاں روتی رہتی ہیں اپنی قسمت کو۔ نورین کو کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیا فائدہ وہ ساری عمر جلتی کڑھتی رہے اور تم اپنے پرستاروں میں گھر سے باہر عیش کرتے پھرو۔“

”میں ایسا گھٹیا آدمی نہیں ہوں؟ کیا آپ کو اندازہ نہیں؟“

”حالات آدمی کو بدل دیتے ہیں۔ اس لیے میں نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔ آگے تمہاری مرضی۔“

کمال وہاں سے رخصت ہوا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہونے والے سسرال میں نہیں تھانے میں تھا۔ جہاں وہ رشتے کی بات کرنے نہیں آیا تھا بلکہ زیر تفتیش تھا۔ وہ اپنے آپ کو سخت بے عزت محسوس کر رہا تھا۔ اتنا ذلیل کیا جائے گا؟ اس قدر توہین کی جائے گی؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت مشتعل تھا۔ اسے ایس پی پر ہی نہیں نورین پر بھی طیش آرہا تھا کہ اس نے اسے بتایا کیوں نہیں تھا کہ اس کا باپ کڑوا کریلا ہے۔ اسے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا اصرار کرتے کہ ابا سے ملو مگر ابا کو اس نے پٹا ڈال کے نہیں رکھا کہ ہر آنے والے پر نہ بھونکے۔ ہونے والے داماد کی بھی بہرحال عزت ہوتی ہے اور اسے یوں بھگا دیا جائے تو کون آئے گا دوبارہ اپنی بے عزتی کرانے۔ جو کرکٹ کو دنیا کا سب سے فضول کام سمجھتا ہو بلکہ کام ہی نہ سمجھتا ہو۔ تضیع اوقات سمجھتا ہو اسے کون قائل کرسکتا ہے۔

اسے نورین پر بھی غصہ تھا کہ وہ کرکٹ میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ یہ اس کے باپ کا دعویٰ تھا۔ اب یا تو وہ یہ کہے کہ میرا ابا پ بکواس کرتا ہے یا پھر اعتراف کرلے کہ وہ اس کے سامنے کرکٹ میں جتنی دلچسپی ظاہر کرتی ہے وہ منافقت ہے۔ اسے کرکٹ سے نہیں کمال سے دلچسپی ہے اور وہ اس کا میچ نہیں اسے دیکھنے آتی ہے۔ ظاہر ہے جیسا باپ ویسی بیٹی۔ باہر سے یہ لڑکیاں کچھ نظر آتی ہیں اندر سے کچھ اور ہوتی ہیں۔ ان کے اصل جوہر کھلتے ہیں شادی کے بعد جب یہ بیوی کے درجے پر فائز ہوتی ہیں اور خود کو نصف بہتر سمجھنے لگتی ہیں جبکہ نصف بدتر ان کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نورین کہے کہ کرکٹ چھوڑو اور ٹھیکے دار بن جاؤ تو میں کہوں جی بہت بہتر۔ اگلے دن سے بیٹ کو ڈالوں چولہے میں... کرکٹ گراؤنڈ کی شکل تک نہ دیکھوں۔ بس کمرشل پلاٹ اور عمارتی نقشے دیکھنے لگوں۔ چلو کوئی بڑا زن مرید اور زر خرید کرکٹر تو یہ کرسکتا ہے مگر کسی ٹھیکے دار کی بیوی یہ کہے کہ بس کل سے ٹھیکے داری چھوڑو... کرکٹ کھیلو اور بڑے کرکٹر بن جاؤ تو یہ ناممکن ہے۔

گھر پہنچ کر اس نے نورین سے فیصلہ کن بات کرنے کی کوشش کی مگر فون ڈیڈ تھا۔ وہ موبائل اس لیے نہیں رکھتی تھی کہ اس کے گھر والے لڑکیوں کو موبائل کے مرض میں مبتلا کرنے کے سخت خلاف تھے۔ اس نے فون کو دیوار پر اس طرح دے مارا جیسے ریسلنگ میں اپنے حریف کو۔ فون کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور ٹی وی آن کردیا۔ ٹی وی پر نشر مکرر کے طور پر ایک مزاحیہ خاکہ دکھایا جارہا تھا جس میں کرکٹر کو جوکر بنا کر پیش کیا گیا تھا اور کرکٹ کی الف بے نہ جاننے والے کرکٹ کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اس کا پارا اور چڑھ گیا۔ ایس پی کی باتوں نے معاملات کو مایوسی کی حد تک بگاڑ دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ اسے فون ڈیڈ ملا ورنہ اس کا بس چلتا تو شاید وہ فون کی طرح نورین کے ڈیڈی کو ڈیڈ کردیتا اور غصے میں نورین سے نہ جانے کیا کچھ کہہ جاتا۔ شادی سے پہلے ہی اسے طلاق دے کر بیٹھ جاتا اور بعد میں پچھتانے سے کچھ نہ ہوتا۔ اس کی بھوک اڑ چکی تھی۔ وہ چائے بنانے کی کوشش کر رہا تھا جب اس کے پڑوسی موسیقار نے کسی نئی فلم کے لیے دھن بنانی شروع کی۔ خادمہ آج چھٹی پر تھی۔ آج کا دن وہ عام طور پر باہر ہی گزارتا تھا۔ کہیں نہ کہیں میچ ہوتا تھا اور نہ یار دوست فارغ ہوتے تھے تو اسے خادمہ کی غیر موجودگی گراں نہیں گزرتی تھی۔ صبح کے ناشتے سے رات کے کھانے تک سب باہر ہی ہو جاتا تھا۔ امور خانہ داری کا اسے ویسے بھی سلیقہ نہ تھا۔

چائے کا گھونٹ لیتے ہی اسے والد صاحب یاد آگئے جو بدذائقہ جوشاندہ ایجاد کرنے کے ماہر تھے۔ اس نے نورین کا غصہ کپ پر اتارا اور اسے دیوار پر کھینچ کر دے مارا اور پڑوسی سے لڑنے پہنچ گیا۔

”یہ کیا بے وقت کی راگنی ہے!“

”تم کیا جانو راگنی کو۔ ماضی میں ہماری فلم انڈسٹری کی مشہور اداکارہ راگنی جو نہایت حسین و جمیل تھی اور اس کی خوبصورت نیلی غلافی آنکھیں اور گھنیری پلکوں کی چلمن جو آج بھی دل پر نقش ہے۔“

”میں اس راگنی کی نہیں تمہاری اس راگنی کی بات کر رہا ہوں جیسے بدروحیں رو رہی ہوں۔“

”میں پھر کہہ رہا ہوں کہ تم کیا جانو اس کی الف بے... صبح کا راگ اور شام کا راگ۔“

”تمہارا ہر راگ میرے لیے روگ بن گیا ہے۔ کان خراب ہو گئے ہیں میرے۔“

”تم کان کٹوا لو۔ گدھے کے کان لگوا لو۔ آج پلاسٹک سرجری نے بڑی آسانی پیدا کردی ہے۔“

”تمہیں پڑوس میں رہنے والوں کا خیال رکھنا چاہیے۔“

”پھر کبھی تم نے ریاض میں دخل دیا تو طنبورہ مار کے تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔ کشتۂ خاص کے تحفے، جا چلا جا۔“

موسیقار پہلوان ٹائپ آدمی تھا چنانچہ کمال نے طنبورے کا مقابلہ بیٹ سے کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسے نورین کے باپ کی پیشکش یاد آئی۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا کسی کو اندر کرانا ہے...؟ مراسم خراب نہ ہوتے تو وہ موسیقار کو ضرور اندر کرا دیتا۔ مزید خرابی موسیقار کی بے سری بیوی کے میدان کارزار میں آجانے سے ہوئی۔ اس کی زبان ایک دو دھاری تلوار تھی اور اس کی آواز کسی جلسہ گاہ کے خراب لاؤڈ اسپیکر سے زیادہ سمع خراش تھی۔ اس نے کمال کو فرار پر مجبور کیا۔ نورین تو ہرگز اس عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حالانکہ ایسے ہی وقت میں عورت حق رفاقت ادا کرتی ہے جب شوہر کسی مصیبت میں ہو۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ موسیقار کی بیوی نے یہ ثابت کر دیا تھا۔

رات تک وہ اپنے کمرے میں کسی زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکارتا رہا۔ بار بار اسے نورین کے باپ کا نوٹس یاد آتا تھا۔ دو میں سے ایک کا انتخاب کرلو۔ کرکٹ یا نورین کا۔ شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی ذہنی کشمکش سے دوچار تھا۔ اپنا فیصلہ وہ وہیں سنا سکتا تھا کہ ایس پی صاحب! لعنت ہے آپ کی دختر نیک اختر اور اپنی محبت پر... کرکٹ میری زندگی ہے اور زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے۔ لیکن وہ تو اس کا فیصلہ ہوتا۔ کمال چاہتا تھا کہ نورین کو بھی فیصلے کا موقع دے۔

نورین سے اس کی ملاقات دو دن بعد ہوئی جب وہ خاصا پرسکون ہو چکا تھا۔

وہ اپنے حریف بنک کے خلاف سیمی فائنل کھیل رہا تھا۔ اس نے تین بہترین کھلاڑی آؤٹ کیے تھے اور چوالیس بالوں پر پچاس رن بنائے تھے۔ دیکھنے والے بہت کم تھے۔ پھر بھی پویلین میں اس کی آمد پر بہت تالیاں بجیں۔ تالیاں بجانے والوں میں نورین بھی تھی۔ وہ پسینہ صاف کر کے منہ دھو رہا تھا کہ وہ ڈریسنگ روم میں آگئی اور مسکرا کر بولی۔

”آج تو بڑے فارم میں ہو... ایک اوور میں چار چوکے...“

”تمہیں کیا؟ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ کیا مجھے الو بنانے؟“ وہ یکدم پھٹ پڑا۔

”وہ تو تم پہلے ہی ہو۔ میں کیا بناؤں گی۔“

”ہاں میں واقعی الو ہوں لیکن تم مجھے الو نہیں بنا سکتیں۔ مجھے معلوم ہے تمہیں کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”کرکٹر سے تو ہے۔“ نورین ہنسی تو اس کی ہنسی فضا میں کھنک گئی۔

”کرکٹر بہت بیٹھے ہیں باہر... جاؤ شاید کوئی ایسا مل جائے جو تمہارے لیے کرکٹ چھوڑ دے۔ میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں کرکٹ نہیں... بھاڑ میں گیا یہ عشق...“

”یہاں بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ چلو اور بتاؤ اس روز کیا بات ہوئی تھی؟“

”جا کے اپنے ابا سے پوچھو... میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ اس نے بھڑک کر کہا۔

”کمال! میں سب کے سامنے تمہیں گریبان سے پکڑ کے کھینچتی ہوئی لے جاؤں گی۔“ اتنا کہہ کر اس نے کمال کا کالر تھام لیا۔ ”میں ڈرتی نہیں ہوں کسی سے... تم جانتے ہو کہ میں کس قدر بولڈ لڑکی ہوں۔“

”ارے نورین! یہ کیا کر رہی ہو۔ چھوڑو مجھے۔ یہ ڈریسنگ روم ہے؟“

”میں پولیس افسر کی بیٹی ہوں۔ بندے کو اٹھا کے لے جاتی ہوں۔“

”تم زیادہ بدمعاشی پر مت اترو۔“ بالآخر کمال نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”تمہارا باپ پولیس افسر ہے اس لیے رعب ڈال رہی ہو۔ جانتی ہو، اس نے کیا شرط رکھی ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ایک کو چھوڑ دو۔ کرکٹ یا نورین کو۔“

”پھر تم نے کیا کہا؟“ نورین نے تجسس سے پلکیں جھپکائیں۔

”اس وقت تو کچھ نہیں کہا۔ کوشش کرتا رہا کہ وہ سمجھ جائے اور بلاوجہ کی بات پر نہ اڑے۔ مگر وہ سمجھنے والا نہیں ہے۔ تم کہتی ہو کہ اسے کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں، مگر وہ مجھ سے زیادہ جانتا ہے کرکٹ کے بارے میں۔ اسے میرے بارے میں بھی معلوم ہے اور تمہارے بارے میں بھی۔ ساری تفتیش مکمل کر چکا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ کرکٹ کوئی کوالی فیکیشن نہیں ہے شادی کے لیے... میں ایک حرام خور رشوت لینے والا اے ایس آئی ہوتا تو ضرور کوالیفائی کر لیتا۔ وہ اے وی پی کو کچھ نہیں سمجھتا۔ کہتا ہے کہ کرکٹ کے بغیر تم کیا ہو۔ ایک عام گریجویٹ... کرکٹ چھوڑ کے کچھ بن کر دکھاؤ۔“

وہ غصے میں مسلسل بولتا رہا۔ چلاتا رہا۔ نورین کے باپ کو اس نے نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ نورین چپ چاپ سنتی رہی۔

”کیا بات ہے؟ تم نے چپ کا روزہ رکھا ہے؟ یا تم سمجھتی ہو کہ میں کتے کی طرح بھونک رہا ہوں۔ جواب دینے کی کیا ضرورت ہے؟“

”تم غصے میں اندھے ہو رہے ہو اور تمہاری کھوپڑی میں بھُس بھرا ہوا ہے۔ تمہارا غصہ نکل جائے پہلے۔ پھر میں بولوں گی۔“

کمال نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں نے وہاں چائے بھی نہیں پی تھی۔“

پھر وہ اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ کے مخصوص گوشے میں جا بیٹھے جو آخری حصے میں تھا۔ جہاں سے باہر کا منظر بہت خوبصورت نظر آتا تھا۔ اب شام ڈھلنے لگی تھی اور ہواؤں میں تازگی آگئی تھی۔ کمال نے غور سے نورین کو اس طرح دیکھا جیسے کسی مصور کا حسین تخیل ہو۔ بنانے والے نے جیسے اسے فرصت میں بنایا ہو۔ وہ سر تا پا اُجلے براق کپڑوں میں ملبوس تھی اور سفید دوپٹے کی محراب میں اس کے چہرے پر ایک ایسا دلکش نکھار آگیا تھا وہ کسی حور کی مانند نظر آتی تھی۔ کانوں اور گلے میں سفید امیٹیشن جیولری اور بالوں میں موتیا کی کلیوں کا گجرا لگائے وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اس ایک لمحے میں کمال کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اس لڑکی پر کرکٹ تو کیا دنیا بھی قربان کی جا سکتی ہے مگر دوسرے لمحے اس نے اپنی جذباتی کمزوری پر قابو پا لیا۔

”تم ابھی تک شش وپنج میں مبتلا ہو؟“ نورین نے اس کا چہرہ نظروں کی گرفت میں لے کر سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”شش وپنج کی کیا بات ہے؟“ وہ بھی اس کی آنکھوں میں ڈوب گیا۔

”دو دن ہو گئے اس بات کو لیکن تم ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچے؟“

”یہ کیسے اندازہ کر لیا تم نے...؟“ کمال نے کسمسا کر پہلو بدلا۔

”تمہاری ذہنی کیفیت سے جو بشرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ غصہ، جھنجھلاہٹ اور بے بسی کی علامت ہے۔ کیونکہ فیصلہ کر لینے والا بہت مطمئن اور پرسکون ہوتا ہے۔“

”ماہر نفسیات مت بنو میرے سامنے...“ کمال چڑ گیا۔

”اوکے... میں نے غلط کہا تھا۔ صحیح بات کیا ہے اب فرما دو۔“

کمال ہاتھوں کو آپس میں رگڑنے لگا اور تیزی سے بولا۔ ”بہت لغویات کی تمہارے باپ نے... انتہائی جاہلانہ اور فضول... وہ ناخواندہ تو نہیں؟ اسے زیب نہیں دیتا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ چلو غصہ ضبط کرو۔ وہ جیسا بھی ہے جو بھی ہے ایک جوان لڑکی کا باپ ہے۔ بولو اب تم کیا کرو گے؟“

”نورین! بالفرض تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”مفروضات پر بات مت کرو۔ جس آدمی کے پاس قوت فیصلہ ہو اسے دو دن بہت ہوتے ہیں سوچنے کے لیے۔ وہ فیصلہ ضرور کر لیتا ہے خواہ وہ کتنا ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہو۔ دونوں طرف کے دلائل کو عقل کی ترازو میں تولا جا سکتا ہے اور فیصلہ کے مثبت یا منفی نتائج کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔“

”یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنی آسانی سے تم نے کہہ دیا؟“

”میں نے کب آسان کہا ہے۔ آسان ہوتا تو تم چٹکی بجاتے میں کہہ دیتے۔ لیس یا نو... اگر مزید مہلت درکار ہے تو بتاؤ۔“

”کوئی فائدہ نہیں نورین!“ کمال نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”چلو۔ پھر ٹاس کرو۔ تقدیر کو فیصلہ کرنے دو۔ مایوس کیوں ہو رہے ہو؟“

”اگر تم ٹاس ہار گئیں؟“ کمال نے اس کی مدھ بھری آنکھوں میں جھانکا۔ ”پھر...؟“

”میں کیسے ہار سکتی ہوں؟“ نورین نے اپنی لمبی پلکوں کو جھپکاتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔

”اگر تقدیر نے فیصلہ صادر کر دیا کرکٹ کے حق میں؟“ کمال یکدم سنجیدہ ہو گیا۔

”تو تم کرکٹ کھیلتے رہنا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہوگا۔“

”اور تم... مجھے چھوڑ دو گی؟“ کمال کے چہرے پر مایوسی کی گھٹا چھا گئی۔

وہ مترنم لہجے میں بولی۔ ”میرے ذہن میں تمہاری جیسی کوئی الجھن اور دل میں مایوسی نہیں ہے!“ پھر اس کا لہجہ شوخ ہو گیا۔ ”میں بہت پہلے جو فیصلہ کر چکی ہوں اس پر ثابت قدم رہوں گی۔“

کمال بھونچکا ہو گیا اور اسے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا۔ وہ بولا۔ ”کیا تھا وہ فیصلہ؟ ماں باپ جہاں کہیں گے شادی کرو گی؟“

”میں تمہارا ساتھ دوں گی... باپ کو چھوڑ دوں گی۔“ نورین نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

کمال پھر بھونچکا رہ گیا۔ اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ”کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟ کہنا بہت آسان ہوتا ہے؟“

”اس میں مشکل کیا ہے۔ ہم شادی کر لیں گے اور بس۔ کون روکے گا ہمیں؟ یہ ہمارا قانونی اور شرعی حق ہے۔ ہر بالغ کو اختیار ہے پسند ناپسند کا۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی اور ان کا باپ۔ ہم کوئی گناہ تو نہیں کریں گے لیکن...“

”لیکن کیا...؟“ کمال نے تجسس سے اسے دیکھا۔

”مجھے افسوس ہوگا تم میرا ساتھ نہ دے سکے۔ باتیں تو بہت کرتے تھے مگر وقت آیا تو تم نے مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جان دینا تو دور کی بات تم نے ایک معمولی سا چیلنج بھی قبول نہیں کیا؟“ نورین کا لہجہ شکوے بھرا تھا۔

”یہ چیلنج نہیں تھا نورین!“ اس نے تکرار کے سے انداز میں کہا۔

”یہ چیلنج ہی تھا۔ تم دنیا پر ثابت کر سکتے تھے کہ تم نااہل نہیں ہو؟ تم میں ہمت اور صلاحیت ہے۔ تمہاری کامیابی کا دارومدار صرف کرکٹ پر نہیں ہے۔ تم اپنی تقدیر کے خود مالک ہو جیسے کرکٹ کے میدان میں تم نے لوہا منوا لیا۔ ایسے ہی کسی اور فیلڈ میں تم کامیاب ہونے کا چیلنج کر سکتے ہو۔ اپنے لیے نہ سہی اپنی محبت کے لیے لیکن تم نے مجھے بہت مایوس کیا کمال! تمہاری مشکل میں آسان کر دیتی۔ میں دوں گی تمہارا ساتھ۔ تم اپنی محبت کی شکست قبول کر لو۔ جا کے کہہ دو میرے والد سے کہ سوری سر! میں کرکٹ نہیں چھوڑ سکتا۔ نورین کو چھوڑ دیتا ہوں۔ بس اس کے بعد تمہیں کچھ نہیں کرنا جو کرنا ہے مجھے کرنا ہے۔“

کمال نے محسوس کیا کہ وہ نورین سے نظر ملانے کی تاب نہیں رکھتا۔ آج تک اس نے کوئی درجن بھر ہر عمر کی لڑکیوں سے عشق کیا تھا اور نورین کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ لڑکیاں بے وقوف اور بزدل تھیں وہ رو دھو کر،

آہیں بھر کے بیٹھ گئی تھیں۔ یہ جاننے کے بعد کہ کمال سے ان کی شادی نہیں ہو سکتی۔ وہ بڑی آسانی سے بھول گئی تھیں۔ انہوں نے کمال کی خاطر گھر چھوڑنے کی پیشکش اور ہمت نہیں کی تھی۔ کوئی اس کے عشق میں پاگل نہیں ہوئی تھی اور کسی نے اس کی خاطر جان دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ عشق نہیں تھا کہ آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے والی بات ہوتی جسے کانٹوں کا تاج سمجھ کے سر پر سجانا آسان ہوتا۔ یہ اعزاز، یہ پندار اور یہ اعتبار صرف نورین کو ملا تھا۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد جب وہ چائے پی کے فارغ ہو چکے تھے نورین نے کہا۔ ”مجھے بے وقوف مت سمجھنا کمال! میں پاگل بھی نہیں ہوں۔ جب میں نے تمہیں حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں ہے جس پر مجھے بعد میں ندامت ہو۔ میں ہار قبول نہیں کر سکتی، نہ آج، نہ آج کے بعد۔ جب تم میرے ہو تو صرف میرے ہو۔ تمہارے سارے شوق تمہیں مبارک مگر میری محبت ایک مقدس امانت ہو گی۔ اگر تم نے اس میں خیانت کی تو تمہیں اتنی آسانی سے قتل کر دوں گی کمال! جتنی آسانی سے میں نے خون کے رشتوں کی قربانی دینا منظور کیا ہے اور ایسی رونی صورت بنا کے مت بیٹھو جیسے میں تم سے گن پوائنٹ پر شادی کر رہی ہوں؟“

”پھر کیا کروں؟“ کمال بڑی مشکل سے بولا۔ اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

”بس نارمل ہو جاؤ۔ سمجھ لو کہ کچھ نہیں ہوا۔ اب میں چلتی ہوں۔“ وہ اپنا چرمی بیگ اٹھا کے بڑی تمکنت سے کھڑی ہو گئی۔

”چلو۔ میں تمہیں چھوڑ دوں۔“ کمال نے کہا اور وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں۔ میں ٹیکسی سے آئی ہوں اور ٹیکسی سے چلی جاؤں گی اور ہاں تمہارا فون خراب ہے کیا؟“

”نہیں اس کا انتقال پُر ملال ہو گیا ہے۔“ کمال نے خفت سے کہا۔ ”میں نے اسے دیوار پر مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔“

”پاگل... گھر کی چیزیں توڑنے سے تو گھر نہیں بنتا۔ اب دوسرا لاؤ گے پیسے خرچ کر کے۔“ اس نے باہر جاتے جاتے کسی کفایت شعار، سلیقہ مند بیوی کی طرح کہا جیسے شوہر کی فضول خرچیوں سے پریشان ہو۔

کمال اسے بڑے اعتماد کے ساتھ بیگ لٹکائے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ نورین نے ایک بار پلٹ کے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کے ہاتھ ہلایا تو بے اختیار اس نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔ چائے کے برتن اٹھانے والا ویٹر زیر لب مسکرا دیا۔ محبت کرنے والوں کی دیوانگی کے ایسے مناظر اس کے لیے انوکھے نہیں تھے۔

رات کا اندھیرا پھیلنے تک کمال وہیں بیٹھا رہا۔ اچانک وہ پر سکون ہو گیا تھا۔ اپنی خلوت میں وہ تنہا نہیں رہا تھا۔ روشن جمالِ یار سے تھی انجمن تمام... اس کے عکس سے ستارے روشن تھے۔ چاند مسکرا رہا تھا اور نیون لائٹس آنکھیں مار رہی تھیں۔

صبح آفس پہنچنے کے بعد اس نے بنک کے صدر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ صدر اس کی گزشتہ دن کی کارکردگی پر خوش تھا۔ مصروفیت کے باوجود اس نے کمال کو بلا لیا۔

”ویل ڈن بوائے۔“ اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملا کے کہا۔ ”فائنل تم نے جیت لیا تو ڈبل بونس اور پروموشن اگلے گریڈ میں...“

”تھینک یو سر!“ وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”یہ میرا استعفیٰ ہے۔“

بنک کے صدر کی مسکراہٹ ایسے کافور ہو گئی جیسے زیادہ وولٹ آنے سے بلب فیوز ہو جائے۔

”وہاٹ... استعفیٰ...؟ آر یو میڈ...؟“

”نہیں سر! میں بالکل ہوش و حواس میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔“

”لیکن کیوں؟“ صدر نے میز پر مکا مارا۔ ”کیا بات ہے؟“

”کوئی بات نہیں سر!“ اس نے سر ہلا کر سر جھکا لیا۔

”شٹ اپ۔ تم نے خود کو بیچ دیا ہے زیادہ قیمت پر... ہمارے مخالفین کے ہاتھ...؟“

”نو سر... یہ غلط ہے۔“ اس نے نفی کے انداز میں سر ہلا دیا۔

”پھر کیا تم بارگین کرنا چاہتے ہو بلیک میل کر کے... ابھی پروموشن چاہتے ہو؟“

”نہیں سر! میں اتنا گرا ہوا آدمی نہیں ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کمال... !کمال... !مجھے خواہ مخواہ پریشان مت کرو۔ پاگل مت کرو۔ یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں... تو پھر کیا ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ سیمی فائنل جیتنے کے بعد اس برس ہمارے فائنل جیتنے کے امکانات پہلی بار کتنے روشن ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے سر!“ اس نے سر ہلاتے ہوئے اعتراف کیا۔

”اور تم ایسے سنہری موقع پر ہمیں دھوکا دے رہے ہو؟“ صدر بری طرح بگڑ گیا۔

”نہیں سر۔ یہ بات نہیں۔ میں قربانی دے رہا ہوں اپنے کیریئر کی۔“

”یہ تمہاری قربانی ہے؟ تم کرکٹر ہو یا قربانی کے بکرے؟ آخر یہ کون سا وقت ہے قربانی دینے کا؟“

”قربانی دینے کا وقت تو ملتا ہے سر! اوپر سے یا اندر سے۔“

”بکواس مت کرو۔“ صدر نے استعفیٰ اس کی طرف پھینک دیا۔ ”میں آدھے گھنٹے میں تمہاری پروموشن کے آرڈر جاری کرتا ہوں۔“

”نہیں سر! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تھینک یو ویری مچ۔ بس آپ مجھے اجازت دیں۔“

”سنو۔ بیٹھو یہاں۔ پاگل مت بنو، مجھے بتاؤ۔ یہ سب کیا ہے آخر؟“ صدر اس کے پاس آ بیٹھا۔ ”کیوں خودکشی کر رہے ہو تم؟ اور آخر اپنے ساتھ ہمیں بھی کیوں مروا رہے ہو؟“

”میری وجوہات ذاتی ہیں سر! اگر آج میں نے کچھ نہ کیا بہت مشکل ہو جائے گی میرے لیے... شاید فائنل کھیلنے کے بعد میں ہار جاؤں۔ مجھے بہت کچھ ملے گا۔ انعام، واہ واہ، عزت شہرت اور دولت۔ ممکن ہے مجھے قومی ٹیم کے لیے منتخب کر لیا جائے۔“

صدر بھونچکا رہ گیا۔ ”کیا تم... یہ سب کچھ نہیں چاہتے؟ عجیب بات ہے؟“

”نہیں سر! مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہیں سب کچھ نہ کھو دوں۔ آئی ایم سوری، ویری سوری سر!“ وہ ایک دم اٹھا اور باہر نکل گیا۔

”یہ ضرور نشے میں تھا جو بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔“ صدر نے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ ”ذرا معلوم تو کرو کہ کمال کو کیا ہوا؟ کل یہ کس کے ساتھ تھا؟ کسی حریف ٹیم کی پلیئر کی فین نے اسے کولڈ ڈرنک میں نشے کی گولی تو نہیں گھول دی تھی؟ دیکھو۔ نظر رکھو اور کڑی نگرانی کرو کہ یہ کہاں جاتا ہے؟“

کمال سیدھا ایس پی عبدالخالق کے گھر گیا۔ اس کی سرکاری جیپ دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور وہ آفس جانے کے لیے تیار تھا۔

”تم... صبح صبح؟ خیریت تو ہے؟ کیا کسی کی خبر لینی ہے جو تمہیں دہشت زدہ اور ہراساں کر رہا ہے؟“ اس نے کمال کو ناشتے کی میز پر بٹھا لیا۔ ”بیٹھو۔“

”میں ناشتہ کر چکا ہوں... شکریہ سر!“ کمال نے بتایا۔

”او کے چائے پیو۔“ اس نے کہا۔ پھر سینڈوچز کی پلیٹ اس کی طرف سرکا دی۔

”سر! میں یہ بتانے کے لیے حاضر ہوا تھا کہ میں نے بنک سے استعفیٰ دے دیا ہے۔“ کمال نے خوشخبری سنانے کے انداز میں کہا۔

”اچھا! کب؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ اس کا لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

”ابھی ابھی... بنک مجھے پروموشن دینے پر تیار تھا۔ وہ بضد تھے کہ میں فائنل ضرور کھیلوں تاکہ ٹورنامنٹ جیت سکیں لیکن میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ میں نے کرکٹ چھوڑ دی ہے۔“ کمال نے بڑی سنجیدگی سے اسے بتایا۔

نورین کے باپ نے کسی خوشی اور حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ ”پھر اب کیا ارادہ ہے؟“

کمال نے آتش اشتعال کو دبا لیا۔ نورین کے خوں خوار باپ سے اسے ایسی امید نہیں تھی۔

”نورین سے شادی کرنے کا۔“ اس نے بھی بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خود کو اس قابل ثابت کرنے کے لیے تم کیا کرو گے؟“

”یقیناً کچھ نہ کچھ کر کے دکھاؤں گا۔“ اس نے یقین کے ساتھ کہا۔ ”میں اپنا مستقبل بنانے کی نہ صرف صلاحیت رکھتا ہوں بلکہ پر عزم بھی ہوں۔“

”اچھا۔ ویری گڈ۔ گڈ لک...“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے آفس کے لیے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔“

وہ سیدھا اپنے فلیٹ پر آیا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ نیا فون سیٹ کل ہی لے آیا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ ”یس۔ میں کمال بول رہا ہوں!“ اس نے رسمی انداز سے کہا۔

”کمال! تم نے مجھے جیت لیا... مجھے فخر ہے تم پر۔ ہاؤ سویٹ یو آر!“ نورین کی مترنم آواز نے کہا۔ اس کا لہجہ خوشی سے بھرپور تھا۔ ”آئی لو یو۔“ پھر فون بند ہو گیا۔

اپنی زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کا جذباتی ردعمل کمال کے لیے خود حیران کن، اچانک اور غیر متوقع تھا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ اس کے اندر خود اعتمادی کا اتنا بڑا خزانہ پوشیدہ ہے۔ بالکل نظر نہ آنے والی اور محسوس نہ ہونے والی جوہری توانائی کی طرح... عشق نے صرف ایک عورت کے عشق نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ وہ ایک ذرّہ تھا جسے اندر سے پھوٹنے والی روشنی کی کرن نے آفتاب کر دیا تھا۔ یہ ہوس نہ تھی۔ یہ کسی خوبصورت عورت کے پُرکشش بدن کی پاگل کر دینے والی طلب نہ تھی۔ اس سے پہلے کمال کی زندگی میں آنے والی درجن بھر لڑکیاں کسی طرح حسن میں کم نہ تھیں لیکن کوئی ایسی بات تھی جو نورین میں تھی جسے صرف وہ دیکھ سکتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا۔ جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی تمنا کو ایسے دفن کر دیا تھا جیسے اس کی حیثیت ایک تنکے کے برابر بھی نہ تھی۔ وہ ٹیسٹ کرکٹر بننا چاہتا تھا اور بن بھی سکتا تھا مگر اچانک اس نے اپنے سب خواب لٹا دیے تھے کسی فیاض شخص کی طرح، جیسے یہ دولت اب اس کے کسی کام کی نہ رہی ہو۔ وہ ساری خواہشات سے دستبردار ہو گیا تھا جن کی پرورش اس نے بچپن سے آج تک کی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کمال کبھی کرکٹ چھوڑ دے گا اور وہ بھی ایک لڑکی کے لیے۔

اسے بہت سے لوگوں نے فون کرنے کی کوشش کی، یہ سمجھانے کے لیے کہ وہ اس احمقانہ فیصلے کو واپس لے لے۔ اسے دوسرے اداروں نے بہتر شرائط پر بلانا چاہا۔ دوستوں اور مداحوں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ اس پر مختلف انداز میں دباؤ ڈالا گیا مگر کمال کے سامنے ایک کھلا چیلنج تھا۔ اس چیلنج کو قبول کر لینے کے بعد سب کچھ غیر اہم ہو گیا تھا۔

وہ جس بنک کی طرف سے کھیلتا تھا وہ فائنل ہار گیا تھا۔ کرکٹ میں چانس کی اہمیت اپنی جگہ مگر ایک بنیادی ستون کے نہ ہونے سے ٹیم کی عمارت کا ڈھانچہ کمزور پڑ گیا تھا۔ ٹیم اسپرٹ میں پڑنے والی یہ دراڑ بہت بڑی تھی جس نے بھونچال پیدا کر دیا تھا۔ کوشش کرنے کے باوجود ٹیم کے دوسرے کھلاڑی اپنا مورال برقرار نہ رکھ سکے۔ کمال کی موجودگی اور اس کے کھیل سے نہ صرف ان کا حوصلہ برقرار رہتا تھا بلکہ خود بھی عمدہ کارکردگی دکھاتے تھے۔ نتیجے میں کمال کے خلاف تیز و تند بیانات کی یلغار ہو گئی جس کی بوچھار ناقابل برداشت تھی۔

بیک وقت دوسری ٹیموں کے منتظم بھی اپنی اپنی بولی بولنے لگے کیوں کہ ان کے نزدیک کمال نے اپنے محسنوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا۔ وہ نمک حرام ہی نہیں بلکہ غدار بھی تھا۔ ناقابل اعتبار تھا۔ اس کے اپنے بنک کے صدر نے سب کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور دوسرے اداروں کے سربراہ اس لیے مجبور ہو گئے تھے کہ وہ ڈر گئے تھے۔ کمال نے جو کیا تھا کل وہ کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔ ان سب نے مل کر کوشش کی تو کرکٹ ایسوسی ایشن نے کمال کو زندگی بھر کے لیے نااہل قرار دے دیا۔ یہ انضباطی کارروائی یک طرفہ رہی۔ کمال نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اور نہ ہی اپیل کی۔ وہ اپنے فیصلے پر چٹان کی طرح جما رہا۔ اس نے کہا۔ ”یہ معاملہ ڈسپلن کا نہیں میری زندگی کا ہے۔ میں کرکٹ کھیلوں یا لوڈو۔ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف مجھے ہے۔“

جب اس طوفان سے اٹھنے والی گرد بیٹھ گئی اور دوست دشمن سب ہی کمال کو بھول گئے تو اس نے عزم نو کے ساتھ اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔

”میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے سوچا۔ حالات کا جائزہ لیا۔

کاروبار کے لیے تجربے اور سرمائے کی شرط تھی۔ اس کے پاس لے دے کے یہی ایک فلیٹ تھا لیکن اس پر بھی بنک کا قرضہ باقی تھا۔ گاڑی تو بنک نے واپس لے لی تھی۔ اسے علم تھا کہ بہت جلد بنک کی طرف سے یہ نوٹس بھی موصول ہو جائے گا کہ وہ قرض کی بقایا رقم ادا کرے ورنہ فلیٹ کا قبضہ حاصل کرنے کے لیے بنک عدالتی چارہ جوئی کرنے پر مجبور ہو گا۔ فلیٹ کی موجودہ قیمت پانچ لاکھ سے زیادہ تھی اور قرض ایک لاکھ سے کم یا زیادہ تھا۔ اگر کہیں سے وہ ایک لاکھ کا بندوبست کر سکتا تو فلیٹ کی ملکیت اس کے نام ہو جاتی۔ پھر وہ اسے بیچ کے پانچ لاکھ سے کوئی سا بھی کاروبار یقیناً شروع کر سکتا تھا مگر ابھی تو اس کے اصل کاغذات بنک کی تحویل میں تھے۔

ایک لاکھ کی رقم قرض کے طور پر حاصل کرنا اچانک جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس کی آمدنی صفر ہو گئی تھی۔ پھر اتنی بڑی رقم قرض دینے کا کون خطرہ مول لیتا۔ جو حقیقی معنوں میں دوست تھے وہ اس کی طرح پھکڑ تھے اور کرکٹر کمال کے سارے فین جو اسے ساتھ لے کر پھرنے میں فخر کرتے تھے نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کوئی ملتا بھی تھا جلدی میں ہوتا یا نظریں چرا کے نکل جاتا۔

کمال نے کچھ دولت مند دوستوں سے وعدہ بھی کیا کہ وہ فلیٹ بیچتے ہی ان کے ایک لاکھ پہلے واپس کر دے گا۔ ”مجھے صرف ایک مہینے کے لیے ادھار چاہیے۔“ اس نے کہا۔ ”کاغذات ملتے ہی فلیٹ بیچنے کے لیے اشتہار دے دوں گا اور فلیٹ کھڑے کھڑے بک جائے گا۔ کیونکہ اس کی لوکیشن ہی ایسی ہے۔ ملنے کو تو مجھے چھ بھی مل سکتے ہیں مگر پانچ لاکھ میں خریدار اسے مفت سمجھ کے لے لیں گے۔“

لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ بنک اسے حق ملکیت دینے کی راہ میں روڑے اٹکائے گا۔ کاغذات اسے قرض ادا کرنے کے بعد بھی نہیں ملیں گے۔ بنکوں میں پبلک کے لیے سرخ فیتے کا نظام نہ سہی۔ کمال کے خلاف تاخیری حربے استعمال کرنے کا مقصد اسے سزا دینا ہو گا جس میں سب عہدیدار شریک ہوں گے۔ سب کی فتح کو شکست میں بدلنے کا ذمہ دار کمال تھا اور اس کا جرم سب کے لیے ناقابل معافی بن گیا تھا۔ وہ قرض کی رقم وصول کرنے کے بعد اسے مشورہ دیں گے کہ اب جاؤ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ نیچے سے اوپر تک فریاد کرو کہ مجھے فلیٹ کا قبضہ دلوایا جائے۔ کل تم نے ہماری نہیں سنی تھی اور آج ہم تمہاری ایک نہیں سنیں گے۔

کمال کو ایک لاکھ کسی نے نہیں دیے۔ ایک لاکھ کیا پانچ لاکھ دینے والوں کی کمی نہیں تھی۔ جبکہ اس کے بام عروج میں اس کے پرستاروں میں صرف لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی تھیں جن کا تعلق اعلیٰ اور سرمایہ دار گھرانوں سے تھا وہ صرف پانچ منٹ میں پانچ لاکھ کی رقم کیا دل بھی دے سکتی تھیں۔ آخر اس نے مایوس اور نامراد ہو کر فلیٹ خالی کر دیا اور کرائے کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ دوسرا فلیٹ چھوٹا تھا اور کسی پوش علاقے میں نہیں تھا بلکہ متوسط طبقے کی آبادی میں تھا۔ اب اسے بسوں میں گھومنا تھا۔ پریشانی ہوتی تھی۔ ٹیکسی کی آمد و رفت بہت مہنگی پڑتی تھی۔ پرانی سب عادتیں ایک دم ترک کر دینا مشکل کام تھا۔ صبح شام کی خاطر تواضع ختم ہو چکی تھی۔ لنچ اور ڈنر نہیں رہے تھے۔ اس نے اپنے پلے سے ہوٹل میں کھانا کھایا تو بازار کا بھاؤ معلوم ہوا۔ اب اسے اور اس کے فرشتوں کو اندازہ ہوا کہ مہنگائی کس چڑیا کا نام ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا پس انداز کیا سرمایہ کسی بے وفا کی طرح دور ہونے لگا۔ وہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں لیکن نوکری تو خواب میں بھی نہیں تھی۔

اب اسے اندازہ ہو گیا کہ نورین کا باپ سچ کہتا تھا۔ ایک معمولی گریجویٹ کے لیے اس شہر میں کوئی کام نہ تھا۔ انجینئر، ڈاکٹر بے روزگار تھے۔ تین ہزار روپے ماہانہ پر نوکری کر رہے تھے۔ ٹائپسٹ اور شارٹ ہینڈ جاننے والوں کی جگہ کمپیوٹر آپریٹر آ گئے تھے۔ مواقع صرف ان کے لیے تھے جو اعلیٰ ٹیکنکل تعلیم حاصل کر چکے تھے یا پھر بہت نچلی سطح پر ویلڈر، پلمبر اور الیکٹریشن جیسی ملازمت پر تھے جن کے لیے بی اے کی ڈگری بے مصرف تھی۔ کرکٹ کھیلنے کے سوا اس نے کچھ نہیں کیا تھا جس کی دنیا کو بالکل ضرورت نہ تھی۔

خدا نے اسے ایک صلاحیت دے کر دنیا میں بھیجا تھا جسے وہ کسی عورت کی طرح طلاق دے کر چھوڑ چکا تھا اور اب اسے اپنے جذباتی فیصلے کے نقصانات پر بھی افسوس ہوتا تھا۔ اس نے بہت عجلت میں اور ہیجانی کیفیت میں جذباتی فیصلہ کیا تھا۔ وہ ڈپلومیسی سے کام لیتا تو آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام وصول کر سکتا تھا۔ وہ فائنل کھیلتا، پروموشن لیتا، نورین کے باپ پر دباؤ ڈلواتا۔ ڈی آئی جی کیا آئی جی، ہوم سیکرٹری سے کہلواتا اور جب نورین خود کہہ چکی تھی کہ وہ کرکٹ نہ چھوڑے اور وہ اپنے باپ کا گھر چھوڑ دے گی تو اتنا آپ سیٹ ہونے کی کون سی بات تھی۔ ایس پی صاحب کا دماغ خود ہی درست ہو کر ٹھکانے پر آ جاتا۔ بیٹی کو وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ نورین جیسی خودسر بیٹی کی شادی بھی وہ زبردستی کسی اور سے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سال چھ مہینے خفا رہتا اور پھر سب ٹھیک ہو جاتا۔ زندگی ہنسی خوشی کٹ جاتی، عزت، شہرت اور دولت کی تکون کے گرد گھومتے لیکن اس نے تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مار کر واپسی کے سارے راستے بند کر دیئے تھے اور آگے جانے کا کوئی راستہ ابھی تک نظر نہیں آیا تھا اور مایوسی کے اس گھپ اندھیرے میں نہ کوئی امید کی کرن...!

نورین کی حوصلہ افزائی بھی اسے مایوسی میں مبتلا کرتی تھی۔ وہ کہتا۔ ”حوصلہ... حوصلہ... حوصلے سے دنیا میں کچھ ہوتا ہے اور حوصلے کا اسٹاک سب میں نے تو نہیں اٹھا لیا۔ کاروبار کے لیے پیسہ چاہیے؟ نوکری کے لیے ہنر چاہیے اور اس کے ساتھ سفارش بھی۔ میرے پاس تو اب اپنا حوالہ بھی نہیں رہا۔“

”تم مایوسی کی بات کیوں کر رہے ہو؟ میں نے کہا تھا نا؟“ نورین بولی۔

”گیا تھا میں وہاں... صرف ڈھائی ہزار روپے کی نوکری تھی۔ صبح آٹھ بجے سے شام آٹھ بجے تک، بڑا تیر مار کر تین ہزار روپے کر دیے تھے صرف آپ کے لیے کمال صاحب...! مائی فٹ... پندرہ سو روپے تو فلیٹ کا کرایہ ہے۔“

”کچھ نہ ہونے سے تو بہتر تھا۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو؟ سارا دن میں اسپتال کی کھڑکی پر آنے والوں کو مسکرا کر کہتا۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں سر! ڈاکٹر ہارون رشید سیکنڈ فلور پر ہیں۔ نو سر! ڈاکٹر رضا نقوی صرف جمعرات کو آتے ہیں... روم نمبر سیون زیرو سیون... سیونتھ فلور پر... ڈاکٹر بیگم نشاط چوہدری آپریشن تھیٹر میں ہیں...“ اس نے زبردستی کی مسکراہٹ طاری کر کے استقبالیہ کلرک کے لہجے کی نقل اتاری۔ ”یہ میرے بس کی بات نہیں تھی نورین! وہاں نہ جانے جاننے والے کتنے آتے...؟ میرے اپنے بنک کے پینل پر تھا وہ اسپتال۔ صدر اور نائب صدر مجھے کاؤنٹر پر بیٹھا دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ اس کا دماغ درست کر دیا۔ بیٹھا ہے کاٹھ کے الو کی طرح ہر ایرے غیرے کو سر کہنے کے لیے... میرے دشمن مجھے تمسخر سے دیکھتے...“

”جب وہ دشمن ہیں تو ان کی پروا کیوں کرتے ہو؟ لعنت بھیجو ان سب کی شکل پر...“

”تم مجھے کیا سمجھتی ہو آخر... میں انسان ہوں یا روبوٹ؟ میرے جذبات نہیں ہیں؟“ کمال بھڑک اٹھا۔

☆...☆...☆

وہ اخباروں میں اشتہار دیکھتا رہا۔ کئی جگہ نورین نے اسے بھیجا لیکن وہ کہیں کام نہ کر سکا۔ ملازمت کی مارکیٹ بہت تنگ تھی۔ سخت تھی۔ استحصال کرنے والے سرمایہ دار اور صنعت کار کم آمدنی والوں کے سارے مسائل سے بے نیاز تھے۔ وہ کسی کو دو ڈھائی ہزار سے زیادہ پر کلرکی نہیں دیتے تھے اور یہ کلرکی بھی غلامی سے بدتر ہوتی تھی جیسے زر خرید نوکر ہوں۔ آتے جاتے سیٹھ کو اٹھ کے سلام کرو۔ وہ کہے تو اس کی گاڑی صاف کرو۔ ضرورت پڑنے پر ڈرائیور بن جاؤ۔ خودی کو بلند رکھنا ہے تو جاؤ کیشیئر سے حساب کر لو۔ فلیٹوں کے ٹاپ فلور پر چڑھ جاؤ اور خودی کو اتنا بلند کرو کہ خدا بندے سے خود پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟ نہ پوچھے تو اوپر سے کود جانا۔ پھر بھی بچ گئے تو پولیس خود ہی پوچھے گی کہ اب بولو بیٹا...؟

جب دونوں ٹانگیں ناکارہ ہو جائیں گی زندگی کسی فٹ پاتھ پر اپنے مفلوج وجود کو گھسیٹتے گزرے گی۔ اور اگر بھیک کسی ٹھیکے دار کے لیے مانگو گے تو وہ تمہیں ایک ریڑھی میں ڈال کے کسی بچے کے حوالے کر دے گا جو آتے جاتے لوگوں سے اپنے ”باپ“ کے لیے کچھ مانگے گا تو اس تماشائے عبرت کو دیکھنے والے ترس کھا کے بہت کچھ دیں گے۔ اب یہ ٹھیکے دار کا خالص نجی اور کاروباری معاملہ ہو گا کہ وہ پولیس کو کتنا بھتہ دیتا ہے اور ایک اپاہج کی ریڑھی میں صرف خیرات آتی ہے یا ہیروئن کی پڑیوں کا منافع بھی...!

ایسے خیالات کمال کو سخت ذہنی انتشار اور دباؤ میں مبتلا کر دیتے تھے اور اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ نورین سے اب اس کی ملاقات بہت کم ہوتی تھی۔ وہ تمام دن شہر میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا۔ سڑک کے کنارے یا کسی پارک میں رکھی ہوئی بینچ پر بیٹھا مستقبل کے خیالی منصوبے بناتا رہتا تھا اور سوچتا رہتا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں اس جیسے تعلیم یافتہ، صحت مند اور باہمت آدمی کے لیے کوئی کام نہیں... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آہستہ آہستہ وہ خود کو قائل کر چکا تھا کہ ڈھائی تین ہزار سے ملازمت کا آغاز کرنا عملی زندگی کی جانب پہلا قدم ہو گا۔ کامیابی پہلے قدم کے ساتھ بہرحال نہیں آتی۔ اگلا قدم۔ پھر اس کے بعد اٹھنے والا ہر قدم اسے کامیابی کی منزل سے قریب تر کرتا جائے گا۔

مشکل یہ تھی کہ اب ڈھائی تین ہزار کی نوکری بھی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ بیروزگاری کا عفریت ان نوجوانوں کو نگل رہا تھا جن کے پاس بی کام، بی اے اور ایم بی اے کی ڈگریاں تھیں۔ ان کی بہتات تھی اور سیلاب تھا جو مجبوری اور پریشانی کے سبب وہ کم سے کم تنخواہ پر ملازمت کرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ایک پیٹرول پمپ پر اسے کیشیئر کی ملازمت مل سکتی تھی بشرطیکہ وہ ایک لاکھ کی شخصی ضمانت فراہم کر دے۔ وہیں دوسرا کام

شروع کیا جا سکتا تھا۔ مالک نے کہا کہ ضمانت نہیں دے سکتے تو چلو پمپ پکڑو اور گاڑیوں میں پیٹرول ڈالنا شروع کردو۔ بارہ سو روپے ماہانہ اور ٹپ ملی تو وہ تمہارا نصیب ہوگا۔ یہاں ٹپ کا رواج صرف ہوٹلوں میں ہے اور پیٹرول ڈلوانے جو آتے ہیں وہ شاذونادر ہی ٹپ دیتے ہیں۔ اگر یہ پاکستان نہ ہوتا امریکہ یورپ ہوتا یہ کام بھی برا نہیں تھا۔

اگر وہ سابق کرکٹر، سابق اے وی پی، فرزند حکیم شرافت علی خان نہ ہوتا بلکہ عام قسم کا نوجوان ہوتا تو مجبوری میں قبول کر سکتا تھا مگر کمال کے لیے اس منظر کا تصور ہی لرزہ خیز تھا کہ اس کے پاس سابق باس کی چمکتی دمکتی گاڑی پمپ پر آکر رکے اور وہ سلام کرکے پوچھے۔ ''کتنا سر...!'' یہی صورت حال ایک دکان پر جوتوں کے سیلز مین، آٹو پارٹس مارکیٹ اور ایک اسنیک بار میں بھی پیش آسکتی تھی۔ چنانچہ جو کام اسے ملے وہ کمال نہ کر سکا جن کی اسے خواہش تھی وہ عنقا تھے۔

نورین جب کبھی ملتی تھی ان کی ملاقات کا انجام لڑائی پر ہوتا تھا۔ وہ نورین کو الزام دیتا تھا کہ اس نے اس کا محبت کے نام پر استحصال کیا اور اسے ایک جذباتی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا جس نے اس کا مستقبل تاریک کر دیا۔ پھر وہ دل گرفتہ انداز میں کہتا۔ ''میں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ عزت، شہرت اور دولت سب کچھ تھا۔ میں ٹیسٹ کیپ لے سکتا تھا۔ میری پروموشن ہونے والی تھی۔ میرے پاس نئے ماڈل کی دلہن جیسی کار تھی اور ایک آراستہ فلیٹ تھا۔''

''افوہ... کتنی بار سناؤ گے یہ ترانہ الم مجھے...'' وہ تنگ کر کہتی۔

''تمہیں سننا پڑے گا۔ تمہاری وجہ سے ہی آج میں ذلت و خواری کا شکار ہوں۔''

''میں نے کیا کہا تھا کہ تم سے کرکٹ چھوڑ دو؟''

''تمہارے خوں خوار باپ نے تو کہا تھا غرا کے...'' وہ جل کر کہتا۔

''باپ کی نہیں میری بات کرو۔ انہیں الزام کیوں دے رہے ہو؟'' وہ بھڑک اٹھی۔

''تم نے مجھے منع بھی تو نہیں کیا تھا؟'' اسے بھی غصہ آجاتا۔

''فیصلہ کرنے والے تم خود تھے۔ میں عورت تھی مگر میں نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ ماں باپ کی مرضی کے بغیر میں تم سے شادی کر لیتی تو کیا میرے لیے رسوائی نہ ہوتی۔ میرے ماں باپ ذلت نہ اٹھاتے۔''

''لیکن اب میں اکیلا دھکے کھاتا پھر رہا ہوں۔ میرے جوتے گھس رہے ہیں۔''

''تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ بس کرنا نہیں چاہتے؟ صرف خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہو؟''

کمال مشتعل ہو جاتا اور برہمی سے کہتا۔ ''کیا چاہتی ہو آخر تم...؟ میں کسی بوٹ ہاؤس میں جوتے پہنانے لگوں جہاں ایک دن تمہارا باپ بھی آئے اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر پاؤں میرے سامنے رکھ دے کہ لو پکڑو میرے پاؤں... یا پھر ویٹر ہو جاؤں کہیں...''

''دیکھو لڑنے سے کوئی فائدہ نہیں... ایک جگہ اور دیکھی ہے میں نے... سیلز مین کا کام ہے مگر دکانوں پر مال سپلائی کرنا ہوگا۔ کمپنی کی گاڑی میں پھرنا اور آرڈر کے مطابق مال دے کر رقم وصول کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے... نہ اس میں کوئی بے عزتی ہے۔ کاسمیٹکس کمپنی ہے۔''

''بے عزتی؟ کیوں نہ ہوگی؟ بے عزتی بہت ہوگی جب اچانک کوئی دکاندار پوچھ بیٹھے گا کہ تم وہی کمال ہو نا؟ کرکٹر!''

''کہہ دینا ہاں! کام کر رہا ہوں چوری تو نہیں کر رہا۔ سیلز مین شپ میں چیلنج ہے۔ مواقع ہیں۔ تم مارکیٹنگ منیجر بھی بن سکتے ہو۔''

''کتنے برس میں؟'' کمال نے تلخی سے کہا۔ ''دس پندرہ برس تو لگ جائیں گے۔ دس پندرہ دن تو نہیں۔''

''ہتھیلی پر سرسوں تو نہیں جمتی۔'' نورین نے بڑے پیار سے کہہ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''سوال دس برس بعد کا نہیں ہے نورین! آج کا ہے۔ حال کا ہے۔ آج مجھے کیا ملے گا؟''

''کمیشن کے ساتھ تین چار ہزار روپے۔'' نورین نے اپنی لمبی سرمگیں پلکیں جھپکائیں۔

''اس میں سے آدھا تو کرائے میں نکل جائے گا۔ باقی آدھے میں کھانا پینا اوڑھنا بچھونا کرنا ہوگا۔ میں اکیلا تو گزارہ کر سکتا ہوں مگر سوچو کیا اس آمدنی میں تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ مجھے اکیلے کو ایک کمرہ بھی کافی ہے مگر شادی کے بعد تم رہ سکتی ہو؟ ایک کمرے کے کوارٹر میں؟ تمہارا ایس پی باپ کسی ایسے شخص کے ساتھ تمہیں جو ایک کمرے میں رہتا ہو جس کے پاس خود کھانے کو نہ ہو۔ تمہاری شادی کر سکتا ہے آخر اس کی عزت بھی ہے شہر میں...''

''چلو۔ تم نے میرے باپ کو عزت دار تو مانا؟'' وہ ہنس پڑی۔

''عزت کرنے والے بھی تو اسی جیسے ہیں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ کہ اس حیثیت کا آدمی اپنی بیٹی کسی کنگلے کے حوالے نہیں کر سکتا۔ میں بھی اس کی جگہ ہوتا تو یہ منظور نہ کرتا کہ بنگلوں اور کاروں کی عادی ناز و نعم پروردہ بیٹی کو ایک کمرے کے فلیٹ میں جھونک دوں جہاں اس کا دم گھٹ جائے۔''

''ایک تو تم ضدی اور حساس اتنے ہو ورنہ ڈیڈی کی سفارش سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔''

''لعنت ہے تمہارے ڈیڈی کی سفارش کی خیرات لینے والے پر... اس سے تو اچھا میں گھر داماد بننا قبول کر لوں اور عیش کروں۔ باغباں بھی خوش رہے۔ راضی رہے صیاد بھی... گل بھی خوش، بلبل بھی خوش...''

''پھر تم کیا کرو گے آخر؟'' نورین نے پیار بھری نظروں سے گھورا۔

''بالآخر میں وہی کروں گا جو اس شہر کے سب باصلاحیت، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوان بد دلی، مایوسی اور فرسٹریشن کا شکار ہو کر کر رہے ہیں جن کو میرٹ پر کوئی نہیں پوچھتا جو اقربا پروری اور سفارش کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں تو اس نظام سے اس پورے سیٹ اپ سے بدلہ لینے اور اپنا حق چھیننے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جو مجبور کر دیے جاتے ہیں کہ اپنی ڈگری اور اپنا ہنر ایک طرف رکھ کے ریوالور اور کلاشنکوف اٹھالیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ چلو کہیں کھانا کھاتے ہیں؟'' نورین کا کومل بدن کسمسایا۔

''میں کیفے دی فٹ پاتھ کا عادی ہو گیا ہوں۔ کسی ہوٹل کے کھانے سے میرا ہاضمہ بگڑ جائے گا۔'' کمال نے کہا۔ ''اب مجھے اپنی اوقات میں رہنے دو۔''

''میں نے ایک اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اس کی فیسیں ہوشربا ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے والدین اور سرپرستوں سے رقمیں بٹورتے رہتے ہیں۔ ان سے کوئی بازپرس کرنے والا نہیں ہے۔ لیکن ٹیچرز کو تنخواہ نہ ہونے کے برابر دیتے ہیں۔ ابھی مجھے تین ہزار دے رہے ہیں۔''

''مبارک ہو... اپنے خوں خوار ڈیڈی سے کہو ایک فون کر دیں۔ وہ چار ہزار بھی دے دیں گے۔'' کمال نے سختی سے کہا۔

''میرا مطلب یہ تھا کہ ہم مل کر گھر چلائیں گے۔ چار میرے تو تین تمہارے... سات ہزار کافی ہوتے ہیں۔ وعدہ کرو کل جاؤ گے سیلز مین کی جاب کے لیے۔''

''وہ بھی ضمانت مانگیں گے کیوں کہ کیش کا معاملہ ہے۔'' وہ نورین کی جادو بھری آنکھوں میں ڈوبنے لگا۔

''تم فکر مت کرو۔ ضمانت میں دوں گی۔ اب چلو اٹھو۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

سیلز مین کا کام دو مہینے چلا۔ کام برا نہیں تھا۔ کم سے کم آمدنی کے اعتبار سے پہلے مہینے ہی میں اسے تنخواہ کے برابر کمیشن مل گیا۔ مجموعی آمدنی پانچ ہزار سے زیادہ ہوئی۔ کمپنی دو نمبر کا مال بناتی تھی۔ ایک مشہور زمانہ کاسمیٹکس بنانے والوں کے لیبل لگا کے مال زیادہ کمیشن پر سپلائی کرتی تھی۔ چنانچہ کم آمدنی والوں کے علاقے میں چھوٹے دکانداروں کے آرڈر بہت تھے۔ متوسط طبقے کے لڑکے، لڑکیاں جن کو اصل کی پہچان نہ تھی بڑے فخر اور مسرت کے ساتھ ان کی مصنوعات استعمال کرتے تھے۔

دو مہینے بعد ایس پی نے کمپنی پر چھاپہ مارا۔ نیچے سے اوپر تک سب کو دھر لیا۔ پھر اینٹی کرپشن والے بھی آگئے۔ وزارت صنعت و تجارت نے کیس ایف آئی اے کو دے دیا۔ سارا مال ضبط ہو گیا اور کمپنی کے مالکان اندر ہو گئے۔ سیلز مین اور سیلز سپروائزر بھی دھر لیے گئے۔ حیرت انگیز طور پر کمال بچ گیا۔ اسے ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پولیس کسی بھی وقت اس کے فلیٹ پر پہنچ جائے گی۔ وہ فلیٹ چھوڑ کے کمال نے نسبتاً غیر آباد علاقے میں کم کرائے کا دوسرا فلیٹ لے لیا۔ نورین کے انکار کے باوجود وہ سمجھتا تھا کہ اسے کسی کے اشارے پر گرفتار نہیں کیا گیا ہوگا۔ اس میں سرخاب کے پر تو نہیں تھے جو قانون کے دام میں آنے سے بال بال بچ گیا۔

وہ ایک بار پھر بے روزگار ہوا تو اسے شدت سے واپسی کا خیال ستانے لگا۔ کیوں نہ وہ کرکٹ کی دنیا میں لوٹ جائے۔ وہاں سب اس کے دشمن تو نہیں ہیں اور اتنی ذلت اٹھانے کے بعد اگر دشمن کے پاؤں پکڑنے پڑیں تو اس میں کیسی بے عزتی؟ برا وقت پڑنے پر گدھے کو باپ بنا لینا تو آج کل زمانہ سازی کی خوبی شمار کی جاتی ہے۔ کرکٹر تو وہ پیدائشی تھا اور پریکٹس نہ کرنے سے اتنا فرق نہیں پڑ سکتا تھا کہ وہ پھر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب نہ ہو۔ دو چار ہفتے کی نیٹ پریکٹس اسے دوبارہ وہی مقام دلا دے گی جہاں سے وہ ذلت و خواری کے گڑھے میں کودا تھا۔ وہ کرکٹ ایسوسی ایشن کی مدد سے ان کے سامنے گڑگڑا سکتا تھا کہ اس کا قصور معاف کر دیا جائے۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ شاید بنک والوں کا دل پسیج جائے۔ پرانی نوکری پر بحال ہونے کا تصور بڑا خوش آئند تھا مگر اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ تاہم کسی دوسرے ادارے میں ایک اچھے آغاز کی امید کی جا سکتی تھی۔

ڈر کی بات یہ تھی کہ کہیں اس طرح وہ نورین کو نہ کھو دے۔

نورین کے لیے اس نے کرکٹ چھوڑی تھی۔ اب کرکٹ کے لیے نورین کو چھوڑنا سو پیاز کھانے کے بعد سو جوتے کھانے کے مترادف ہوگا اور کرکٹ میں بھی چانس نہ ملا تو نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم والی بات ہو جائے گی۔ وہ سخت ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ اچانک اسے ایس پی عبدالخالق نے طلب کر لیا تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔

''ڈیڈی نے تمہیں بلایا ہے۔ کل صبح سات بجے ناشتہ ان کے ساتھ کرو۔''

وہ حیران ہوا۔ اس نے تعجب خیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''تمہارے ڈیڈی نے؟ واقعی؟ یا تم نے...؟''

''ہاں۔ بابا! وہ پولیس والے ہیں اور پرانے پاپی... انہیں سب معلوم ہو جاتا ہے۔ تمہارے اور میرے شب و روز کے ہر لمحے، ہر پل کی انہیں خبر ملتی رہتی ہے۔ تمہیں کبھی بتایا نہیں میں نے لیکن میری خود کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ اس لیے میں کبھی تمہارے فلیٹ میں نہیں آئی، ہمیشہ باہر ملتی رہی ہوں اور وہ بھی سب کے سامنے...''

''تمہارے پیچھے بھی پولیس لگی رہتی ہے نورین؟'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''ہاں بھئی۔ سادہ کپڑوں والے میرا تعاقب کرتے ہیں غیر محسوس انداز سے لیکن مجھے معلوم ہے۔''

''تم نے کبھی احتجاج نہیں کیا کہ آخر ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ جیسے تم کوئی مشتبہ ملزم ہو؟''

''ایک نہیں بلکہ متعدد بار... ڈیڈی نے ہر بار یہی کہا کہ زمانہ خراب ہے۔ ایسا تمہاری حفاظت کے لیے ضروری ہے۔'' نورین نے جواب دیا۔

''میں نے سنا ہے۔ تمہارے بھائی بھی بہت نامی گرامی ہو گئے ہیں۔'' کمال نے کہا۔

نورین اداس ہو گئی۔ اس کے چہرے پر حزن، ملال برسنے لگا۔ ''ہاں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ حرام کی کمائی نے انہیں بگاڑ دیا لیکن اس کی اصل وجہ ہے ڈیڈی کی عدم توجہی اور امی کی بے جا طرفداری۔ ڈیڈی دن رات گھر سے باہر اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ لڑکے اسکول جا رہے ہیں یا نہیں۔ پڑھائی میں کیسے ہیں؟ یہ انہوں نے کبھی نہیں پوچھا۔ امی نے حد سے زیادہ ڈھیل دی۔ جتنا پیسہ مانگا دے دیا۔ وہ اسکول میں بھی شہزادے تھے اور سب ان سے ڈرتے تھے۔''

''ان سے نہیں ایس پی صاحب کی تڑی سے ڈرتے ہوں گے۔''

''ایک ہی بات ہے۔ وہ باپ کے اختیار اور عہدے سے سب کو دباتے تھے اور غلط قسم کے لوگ ان کو استعمال کرنے لگے تھے۔ کالج میں پہنچے تو باقاعدہ بدمعاشی پر اتر آتے۔ ڈیڈی سے شکایت کرنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ ممی سب چھپاتی رہیں۔ آج وہ شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔''

''اور تمہارے ڈیڈی کے مخبر کہاں گئے جو انہیں میرے بارے میں ایک ایک بات بتاتے تھے؟''

''وہ بے چارے حکم کے غلام ہیں۔ وہ ایس پی صاحب کے بیٹوں پر الزام نہیں لگا سکتے۔ وہ سچ بھی بتائیں گے تو اسے جھوٹ ہی کہا جائے گا۔ خود ممی جوان کی پردہ دار ہیں اور ڈیڈی بھی اولاد کے معاملے میں جیسے اندھے ہو گئے ہیں۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہر باپ کا المیہ ہے۔ وہ بڑی مشکل سے تسلیم کرتا ہے کہ اس کی اولاد میں کوئی خرابی ہے۔ خرابی اسے زمانے میں نظر آتی ہے۔ مجھے ایک بات بتاؤ۔ تمہارے یہ داداگیر بھائی مجھ سے کبھی نہیں الجھے۔ وہ میری ہڈی پسلی کرنے کی دھمکی تو دے سکتے تھے۔ کیا انہیں علم نہیں...''

''میرا خیال ہے کہ نہیں۔ ان کی مصروفیات ایسی ہیں کہ انہیں گھر کی خبر نہیں۔ ممی ڈرتی ہیں مگر انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں کتنی ضدی ہوں۔ کالج میں ایک پروفیسر تھے۔ اکنامکس پڑھاتے تھے۔ بڑے مہذب خوش مزاج اور خوش شکل۔''

''خوش شکل؟'' کمال نے لقمہ دیا۔ ''کیا تصوراتی محبوب کی طرح؟''

”ہاں خوش شکل!... میں بھی ان پر فریفتہ تھی۔ باقی سب لڑکیوں کی طرح...“

”اور وہ کس پر فریفتہ تھے...؟“ کمال نے حاسدانہ لہجے میں کہا۔

”وہ شادی شدہ تھے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”مگر وہ ایسے نہیں تھے۔ بڑے مضبوط کردار کے مالک تھے۔ میں کچھ حد سے بڑھ گئی اور ان سے ٹیوشن پڑھنے لگی۔ میری ایک بہت ذلیل سہیلی تھی۔ اس نے مارے حسد و جلن کے ممی کو فون کر دیا اور ایک کی دس لگا دیں۔ سب جھوٹ تھا کہ میں اس لیکچرار کے ساتھ پھرتی ہوں اور وہ شادی شدہ ہوتے بھی مجھ پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ اس سے قبل مجھے واقعی علم نہ تھا کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ ممی نے ڈیڈی سے کہا اور ڈیڈی نے اس لیکچرار کو اٹھوا لیا۔ اس کے پاس سے ہیروئن برآمد ہو گئی۔ ناجائز اسلحہ نکل آیا۔ اس کا تعلق ایک دہشت گرد تنظیم سے ثابت ہو گیا۔ پولیس نے اس سے اقبالِ جرم کروانے کے لیے اتنا مارا کہ وہ معذور ہو گیا۔ اس وقت میں نے ممی ڈیڈی کو بتایا کہ میں کیا چیز ہوں۔ میں نے خود کشی کر لی۔“

”خود کشی... جو تم اکثر کرتی ہو؟“

نورین ہنسی۔ ”میں خواب آور گولیاں کھا کر سو گئی اور ایک خط لکھ کے رکھ دیا کہ میں اس ظلم اور تشدد کے خلاف احتجاج کر رہی ہوں۔ مجھے تو خیر بچا لیا گیا اور ساتھ وہ لیکچرار میری وجہ سے بچ گیا۔ میں نے صاف کہا کہ اگر اس بے گناہ کو چھوڑا نہ گیا تو اگلی مرتبہ میں خود کو شوٹ کر لوں گی۔“

”گویا تمہاری یہ امریکی انداز کی دھمکی کام کر گئی؟“ کمال ہنسا۔

”میری دھمکی اس لیے کارگر ہو گئی کہ مجھے اپنی بات منوانی آتی ہے۔ میں والدین کی کمزوریوں سے آگاہ جو ہوں۔“

☆...☆...☆

ایس پی عبدالخالق نے کمال کا غیر متوقع پُرتپاک استقبال اس انداز سے کیا جیسے وہ کوئی ہوم سیکرٹری ہو اور اسے ناشتے کی میز پر ساتھ بٹھا لیا۔

”آئندہ کے لیے کیا سوچا ہے؟“ اس نے بغیر کسی تمہید کے سوال کیا۔

”سچ تو یہ ہے کہ واپس جانے کا سوچا ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ میں کرکٹ کھیلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔“

”شاید اب تم کرکٹ بھی نہیں کھیل پاؤ گے؟“ عبدالخالق نے یوں کہا کہ اسے دھمکی سمجھا جا سکتا تھا۔ ”پھر کیا کرو گے؟“

”کرنے کو تو بہت کچھ ہے۔ میں ریڑھی پر کباب لگا سکتا ہوں۔ فٹ پاتھ پر حلیم لے کر بیٹھ سکتا ہوں۔“

”کہنا آسان ہے۔ کر کے دکھاؤ تو بات ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مطلب یہ ہے کہ آپ کرنے نہیں دیں گے۔ پولیس سب سامان کے ساتھ مجھے ہیروئن کے الزام میں پکڑ کے لے جائے گی۔“ کمال نے تلخی سے کہا۔

”مطلب تو خوب نکالتے ہو تم...؟“ ایس پی عبدالخالق نے تعریفی انداز میں کہا۔

”اس لیے کہ میں پولیس کی فطرت سے خوب واقف ہوں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں آپ کی سرپرستی قبول کر لوں۔ اور وہ دھندے شروع کر دوں جن میں پیسہ ہی پیسہ ہے۔ آپ کا دستِ شفقت سر پر ہو گا تو کسی کی کیا مجال کہ مجھے پکڑے۔“

”میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں نے اسی لیے وہ کمپنی بند کرا دی جس میں تم جعلی مال بیچ رہے تھے۔ تمہاری وجہ سے ان کا بزنس خراب ہوا۔ تم اس شہر میں کوئی غلط کام نہیں کر سکتے۔“

”پھر آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں؟“

”تم نہ صرف نوجوان بلکہ باصلاحیت بھی ہو۔ بہت کچھ کر سکتے ہو۔ مثلاً بزنس...“

”خالی ہاتھ...؟“ کمال تلخی سے ہنسا۔ ”بزنس کے لیے بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟“

”رقم تم دوڑ دھوپ کر کے پکڑ سکتے ہو... پانچ لاکھ میں کوئی بزنس کیا جا سکتا ہے۔“

کمال ہنس پڑا۔ ”پانچ لاکھ ہوتے تو پھر بات ہی کیا تھی؟“

”بے وقوفوں کی طرح ہر بات پر ہنسنا اچھی بات نہیں۔ میرا خیال تھا کہ تم ذہین آدمی ہو اور وسائل پیدا کر لو گے مگر تم نے اپنے لیے صرف مسائل پیدا کیے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ تم نے میری یا کسی اور کی مدد قبول نہیں کی۔ تجربہ آدمی کو بہت کچھ سکھاتا ہے۔ میں نے تمہیں ایک راہ دکھا دی ہے۔ اب جاؤ اور سوچو کہ جائز طریقے سے کہاں سے مل سکتے ہیں پانچ لاکھ روپے؟“

کمال اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”سر۔ فرض کیجیے میں پانچ لاکھ روپے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا پھر؟“

”تم کاروں کا شوروم کھول سکتے ہو۔ دو چار گاڑیاں سامنے کھڑی ہوں گی تو دس بیس اور آ جائیں گی۔ لوگوں کی گاڑیاں بیچو اور اپنا کمیشن کھرا کر لو۔ یہ ایک جائز منافع بخش کام ہے جس میں صرف برس دو برس بعد تم خود گاڑیاں خرید کے بیچ سکو گے۔ یہ نہیں تو پراپرٹی ڈیلر بن جاؤ۔“

”مگر سر! مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں۔“

”کیا کوئی تجربہ ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے؟ تجربہ کرنے سے آتا ہے۔ اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ آفس کا وقت ہو گیا ہے۔“

کمال واپس ہوا تو ایس پی عبدالخالق کے بارے میں اس کی رائے یکسر بدل چکی تھی۔ وہ پولیس افسر جیسا بھی تھا کمال کے حق میں ایک مخلص اور بے لوث دوست کی طرح بے غرض ثابت ہوا تھا۔ بے شک وہ اپنی چہیتی بیٹی کی وجہ سے مجبور تھا۔ اگر وہ روایتی باپ بن جاتا تو کمال کا حشر بھی اس لیکچرار سے بھی برا ہوتا جسے نورین نے بچا لیا تھا۔ اس بار نورین کو پتا بھی نہ چلتا کہ کمال کہاں گیا؟ آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی؟ وہ یہی سمجھتی کہ شدید مایوسی کی کیفیت میں اس نے خود کشی کر لی یا پھر وہ شہر میں نہیں بلکہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ دبئی یا امریکہ بھاگ گیا اور تھانے تھانے گھوم کے کمال کبھی پھر باہر آتا تو نورین ہی کا نہیں اپنا نام بھی بھول چکا ہوتا۔

وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا اور بستر پر دراز ہو کر ایس پی عبدالخالق سے ہونے والی گفتگو پر انتہائی سنجیدگی سے سوچ بچار کرنے لگا۔

سوچ بچار میں اس کی نیند کوسوں دور ہو گئی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ پانچ لاکھ روپے کہاں سے لائے۔ آدھی رات کے وقت اس مسئلے کا حل اس پر اچانک نازل ہوا۔ اس کے ذہن کے تمام تاریک گوشے جیسے منور ہو گئے۔ صبح ہوتے ہی وہ وکیل کے گھر جا پہنچا۔ وکیل تو اسے جیسے بھول چکا تھا۔ اسے کیس کی پیشگی رقم آدھی مل چکی تھی اور وکالت نامے پر دستخط کرنے کے بعد موکل خود غائب ہو گیا تھا گدھے کے سر سے سینگ کی طرح... کمال کو دیکھا تو سوچنے لگا کون ہے۔ پھر اچانک اسے یاد آیا۔ وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”اچھا۔ حکیم شرافت علی خان، نجابت علی وراثت علی۔ میرا مطلب ہے ان کے حق وراثت کا مقدمہ...“

”جی۔ اچھا ہوا یاد آ گیا آپ کو؟“ کمال نے خوش دلی سے کہا۔

”یاد کیسے نہیں آئے گا؟ بھئی تم وہ ہو نا... ہلال احمر... حکیم نجابت علی خان کے بیٹے؟“

”ہلال احمر نہیں... کمال احمد... میرے والد مرحوم شرافت علی خان تھے۔“

”اچھا۔ اچھا۔ خیر۔ وہ کیس لگا ہوا ہے بھئی۔ تاریخ منشی کو یاد ہو گی۔“

”میں جاننا چاہتا تھا کہ اس میں کیا پیش رفت ہوئی ہے؟ کب فیصلہ متوقع ہے؟“

”فیصلہ...؟“ وکیل کا منہ یوں کھلا کا کھلا رہ گیا جیسے کمال نے پوچھ لیا ہو کہ گدھے کے سر سے غائب ہونے والے سینگ کب واپس آئیں گے۔ ”بھئی کمال احمد... کمال کرتے ہو۔ ابھی سے فیصلہ؟ ابھی تو سمن تعمیل ہوئے ہیں یا شاید نہیں ہوئے۔ تم شام کو آفس آؤ تو فائل دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔“

شام کو فائل دیکھ کر اور مقدمے کا طریق کار سمجھ کے کمال کو سخت مایوسی ہوئی۔ دعویٰ، جواب دعویٰ۔ بیان حلفی، شہادت، اعتراضات اور جرح، ہر کیس میں چھ ماہ لگ جانا عام سی بات ہے۔

”اس کیس میں الجھاؤ زیادہ ہے۔“ وکیل نے کہا۔ ”تمہارے ابا اور چچا اپنی زندگی میں جائداد کی تقسیم کر لیتے تو تمہیں براہِ راست حقِ وراثت مل جاتا۔ اب پہلے تو جائداد ملکیت قرار دی جائے گی۔ حکیم شرافت علی خان اور نجابت علی خان مرحوم کی۔“

”نجابت علی خان تو حیات ہیں۔“ کمال نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”سوری! میں کام کی زیادتی کی وجہ سے کنفیوز ہو جاتا ہوں۔“

”مجھے لگی لپٹی رکھے بغیر بتائیے... کیس میں کتنے ماہ یا برس لگ جائیں گے؟ مجھے میری زندگی میں کچھ ملے گا بھی یا نہیں؟“

وکیل نے حسبِ عادت اپنا سر کھجایا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ”بھئی تمہارا کیس ٹھیک ہے مگر تمہارے مخالف اسے خراب کرنے پر آمادہ ہیں۔ جعلی کام کر رہے ہیں بڑے دھڑلے سے...“

”کیسا جعلی کام؟“ کمال نے چونک کر پلکیں جھپکائیں۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”بھئی رسیدیں ہیں ان کے پاس... اسٹامپ پیپر ہیں اور گواہ ہیں۔ اس بات کے کہ تمہارے والد نے ساری جائداد ان کے پاس رہن رکھ دی تھی۔ مطلب یہ کہ ان سے مسلسل قرضہ لیتے رہے اور ادائیگی کبھی بھولے سے بھی نہیں کی۔“

”یہ جھوٹ ہے؟“کمال کو غصہ آ گیا۔اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”اچھا پھر اب تم دوسرا جھوٹ بھی سن لو۔ تمہارے والد شوقین مزاج تھے۔ کوٹھوں پر جا کر بڑی دولت لٹائی انہوں نے... کوئی جگنو بائی ہے۔ وہ بھی گواہوں میں شامل ہے جسے انہوں نے نقد اور زیورات کی صورت میں بہت کچھ دیا تھا۔“

”یہ۔یہ سراسر بہتان ہے۔وہ ایک وضع دار اور شریف النفس شخص تھے ساری دنیا جانتی ہے کہ...“

”بس اب تم سنتے جائو۔“ وکیل نے درمیان میں ٹوکا۔”تیسرا جھوٹ...ان کی ایک خفیہ شادی تھی۔“

کمال نفرت اور غصے سے کانپنے لگا اور اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔وہ بولا۔”میں نجابت علی کو قتل کر دوں گا۔“

وکیل نے فائل بند کر دی۔اپنے سر کو سہلایا اور کہا۔”ویری گڈ۔اس طرح فیصلہ جلدی ہو سکتا ہے۔ تمہیں پھانسی ہو جائے گی تو واحد وارث ہو گی لالہ رخ...میں اپنی بقیہ فیس آخری ملاقات کے وقت معاف کر دوں گا۔“

”وکیل صاحب!“کمال پھر بیٹھ گیا۔”آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔“

”بیٹا! عدالت میں آئو تو پتا چلے گا کہ جھوٹ کیا ہوتا ہے اور سچ کیا۔جب تک ثابت نہ ہو، جھوٹ کو جھوٹ مانا جاتا ہے اور نہ سچ کو سچ... تمہارے پاس کیا ہے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تمہارے والد صاحب نے چچا سے کبھی قرض نہیں لیا۔ ساری رسیدیں بوگس ہیں۔ جگنو بائی بکواس کرتی ہے اور ان کی کوئی خفیہ شادی نہیں ہوئی تھی۔ان کے پاس دستاویزات ہیں اور گواہ بھی ہیں۔اور دیکھو میاں شہزادے...عدالت میں ضمیر کا حوالہ کبھی مت دینا اور نہ ہی حلف اٹھانے کی بات کرنا۔عدالت کسی ضمیر صاحب کو نہیں جانتی۔ حلف وہاں دن رات اٹھائے جاتے ہیں خدا کو حاضر و ناظر جان کے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے کچھ نہیں ملے گا؟“ وہ مایوسی سے بولا۔

”ملے گا... صبر کا میٹھا پھل ملے گا۔“ وکیل نے کہا۔”چار چھ یا آٹھ دس برس میں مقدمے کا درخت اتنا بڑا ہو جائے گا کہ پھل دے گا۔ تم اپیل پر اپیل کرتے جائوگے۔ وکیل بدلوگے، ہر وکیل فیس پہلے لے گا۔ آخر میں تمہیں پتا چلے گا کہ جتنا وقت اور پیسہ برباد ہوا اس کی زکوٰۃ بھی تمہیں نہیں ملی۔ آج صبح تک صورت حال کچھ اور تھی۔ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ایک فون ملا۔ تمہارے کسی خیر خواہ کا اور اس نے مجھے کہا کہ لڑکے کو قانون کے کھیل میں مت الجھائو۔اسے صاف بتادو کہ کیا کرنا چاہیے۔“

”وہ خیر خواہ کیا پولیس کا کوئی افسر اعلیٰ تھا؟“

”سوری۔یہ میں بتا نہیں سکتا۔پیشہ ورانہ اخلاقیات کا تقاضا ہے۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”تو پھر آپ یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”ہاں۔یہ ہوئی نا بات۔ تو بیٹا! تمہیں مقدمے بازی ختم کر کے اپنے چچا سے سمجھوتا کر لینا چاہیے لیکن سمجھوتا کرنا بھی آرٹ ہے۔ اگر تم نے جھک کے کیا تمہیں وہ ٹھوکر مار دے گا اور کہے گا کہ عدالت میں بات کرنا۔ اکڑفوں کے ساتھ کروگے تو تمہارے خلاف فوجداری مقدمہ بنا دے گا کہ تم اسے مارنے اور دھمکانے آئے تھے۔“

”پھر؟“ کمال کو ایسا لگا جیسے اس کی عقل خبط ہونے لگی ہے۔

”میں بات کرتا ہوں اس کے وکیل سے... وکیل ہی سمجھوتا کرا سکتے ہیں۔ میں تمہاری طرف سے جوابی کارروائی کے امکانات واضح کروں گا کہ تم کیا کچھ کر سکتے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو۔ میرا موکل نہ کمزور ہے اور نہ احمق... وہ ایک جھوٹ کے جواب میں دو جھوٹ بولے گا اور حکیم صاحب کی فیملی کو بھی عدالت میں کھینچ لے گا،اس کا بڑا اثر ورسوخ ہے۔وہ ہر قسم کے کیس درج کرا سکتا ہے۔ جب انہیں خوف پیدا ہو گا تو وہ تمہیں برابر کا حریف سمجھ کے بات کرنے پر مجبور ہوں گے اور کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر بات بن جائے گی۔ میرا نیک اور مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ روپے میں آٹھ آنے نہ ملیں تو چھ آنے بھی قبول کر لو۔ مگر اس طرح کہ تم نے جان چھڑانے کے لیے حاتم کی قبر پر لات ماردی اور انہیں چار آنے زیادہ دے کر ان پر احسان کیا۔ وہ سب میں کر لوں گا۔“

”پھر میں کب آئوں؟ کل کس وقت حاضر ہو جائوں؟“ کمال نے پوچھا۔

”کل پرسوں نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔”ایک ہفتے بعد۔ آج ہی کے دن اس وقت۔ منشی جی! ان کا نام لکھ لیں۔“ اور پھر اس نے کمال کو رخصت کرنے کے لیے تپاک سے ہاتھ بڑھا دیا۔

☆...☆...☆

ایک ہفتے بعد وہ وکیل کے آفس پہنچا تو وکیل نے اس سے پُرجوش مصافحہ کیا اور پُرجوش لہجے میں بولا۔”کمال میاں! مبارک ہو۔ تمہارا کام بن گیا سمجھو۔“

”وہ کیسے...؟ کیا بڈھا مان گیا ہے؟“ کمال نے تجسّس سے پوچھا۔

وکیل نے اسے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔اسے کمال کا استہزائیہ لہجہ ناگوار لگا تھا۔اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔”بیٹا! وہ چچا ہے تمہارا اور غالباً سسر بھی ہو سکتا تھا۔ خیر۔اس نے بلایا ہے تمہیں؟“

”مجھے کیوں بلایا ہے؟“ کمال نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا۔

”بھئی بات کرنے کے لیے... مقدمے بازی اور دشمنی ختم کرنے کے لیے... ضبط، عقل اور سمجھداری سے کام لو برخوردار! سیاست سمجھتے ہو؟ تم جیسے نوجوان کے لیے تو یہ نہایت آسان کھیل ہونا چاہیے۔ لوگ گدھے کو والد کہہ دیتے ہیں جبکہ وہ تمہارا سگا چچا ہے۔ تم جائو اس کے گلے لگ جائو اور قدم بوسی بھی کر لو۔ وہ اس طرح حل ہو جائے گا جیسے پانی میں بتاشا؟“

”جناب! یہ ناممکن ہے کہ میں اتنا گر جائوں؟“ کمال بولا۔

”اگر یہ ناممکن ہے تو پھر کچھ ملنا بھی ناممکن ہے۔ جائو اگلی پیشی دو ماہ بعد ہو گی اگر عدالت میں جج آ گیا تو۔“ وکیل نے رکھائی سے کہا۔”عجیب احمق آدمی ہو۔ میں تمہارے فائدے کی بات کر رہا ہوں جبکہ وکیل صرف اپنے فائدے کی بات کرتا ہے۔اپنے پیروں پر کلہاڑی مت مارو۔ آج قسمت سے ایک موقع ملا ہے تمہیں تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایکٹنگ کرو، ڈراما کرو، ڈھونگ رچائو، الو بنائو، اس بوڑھے کو کیونکہ یہ مقدمے بازی سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ جب تمہیں تمہارا حصہ دے دے تو کہنا کہ لعنت خون کے رشتے پر... تم میرے پچانہ میں تمہارا بھتیجا۔ باپ بڑا نہ بھیا سب سے بڑا روپیا۔ ایسا ازل سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے بوڑھے وکیل کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔

☆...☆...☆

صبح وہ مطب کھلنے کا انتظار بڑی بے چینی اور بے تابی سے کرتا رہا۔

اس نے دور ہی سے چچا نجابت کو رکشے سے اترتے دیکھا اور ان کے پیچھے پیچھے شفاخانے میں داخل ہو گیا۔ مطب کی حالت سے ابتری ظاہر تھی۔ میلی دیواریں، بوسیدہ بنچیں، میل سے سیاہ پارٹیشن۔ برسوں پرانے مرتبان اور ٹین کے ڈبے، چھت کے جالے۔ گھٹن، بو اور نیم روشن ماحول میں ویرانی کا تاثر گہرا ہو گیا تھا۔ صدیوں کے آبائی پیشے کا دمِ آخر تھا۔ایک خاندان کی روایات اور تہذیب کی آخری نشانی حکیم نجابت علی خان سفید ہو گئے تھے اور کمر جھک گئی تھی مگر دم خم وہی تھا۔

”چچا جان۔آداب!“ کمال نے پیچھے سے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا۔

وہ تڑپ کے پلٹے۔یہ آواز غیر مانوس نہ تھی لیکن گرم گرم سیسے کی طرح پگھل گئی۔

”تم...؟“ ان کی آواز حلق میں پھنس گئی اور نظر کمال کے چہرے پر جم گئی۔وہ گول دستے والی چھڑی کے سہارے کھڑے کانپتے رہے۔

”چچا جان! میں کمال احمد ہوں۔آپ کا بھتیجا۔“

انہوں نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔”اس نام کا ایک مدعی تو ہے جس نے میرے خلاف حق وراثت کا مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔“

”یہ چھڑی اٹھائیے چچا جان اور میری کھال ادھیڑ دیجیے۔“ کمال نے کسی مجرم کے انداز سے سر جھکا دیا۔

چچا نجابت کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ اور چہرے پر تنائو آ گیا۔”کوئی گواہ بھی ہو گا باہر... فوٹو گرافر بھی ساتھ لائے ہو گے تم تاکہ میں چھڑی اٹھائوں تو میرے خلاف اقدام قتل کا مقدمہ بن جائے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ چچا جان! میں اکیلا آیا ہوں۔“

”پھر ضرور تم پستول لائے ہو گے۔ صبح صبح یہاں کوئی میرے خون کی گواہی دینے والا بھی نہیں۔ تمہارے راستے کا یہ کانٹا بھی نکل جائے گا۔“

”چچا جان! کیا میں آپ کا خون نہیں ہوں؟ ابا کے اور آپ کے جسم میں گردش کرنے والا لہو تو ایک ہی تھا۔“

”اچھا بڑی جلدی خیال آ گیا تمہیں...؟ دور ہو جائو میری نظروں سے ناخلف، کمینے۔“ وہ ایک دم گرجنے لگے۔”یہاں کوئی چچا نہیں ہے تیرا؟ جھوٹ بولتا ہے کہ تیرا اور میرا خون ایک ہے۔ بھائی شرافت علی کی اولاد ہی نہیں ہے تو... تو قاتل ہے ان کا۔“

”میں آپ کا مجرم ہوں۔ ہر سزا کے لیے تیار ہوں چچا جان...!“ اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

”ارے جا... یہ بڈھا ابھی مرنے والا نہیں ہے۔ میرا دماغ تیرے جیسے ابن الوقت مکاروں کی چال بازی کو خوب سمجھتا ہے۔ صرف جائداد کا لالچ تجھے اس دہلیز پر لے آیا ہے۔ یہ میری محبت نہیں ہے۔ دولت کی ہوس ہے مگر میں صاف بتا رہا ہوں تجھے۔اس میں سے تجھے پھوٹی کوڑی ملنے والی نہیں ہے تو کر لے بڑے سے بڑا وکیل۔ نکل جا یہاں سے فوراً۔ پھر کبھی اپنا منحوس اور مکروہ چہرہ دکھانے کی

کوشش مت کرنا ورنہ میں پولیس کے حوالے کردوں گا جو میرے پاس علاج معالجے کے لیے آتے رہتے ہیں۔“

کمال خاموش، ضبط اور تحمل سے سنتا رہا اور اندر ہی اندر کھولتا رہا مگر زیر لب مسکراتا رہا، اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

”چچا جان! ابا کی روح کو شرمندہ نہ کریں۔ کل رات انہوں نے خواب میں آ کے مجھ سے کہا کہ کمال! ابھی جا اور چچا کے پاؤں پکڑ لے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ تجھے معاف کردیں گے۔ معاف نہ کریں تو ان سے کہنا کہ اگلی جمعرات کو میری قبر پر چراغ روشن نہ کریں۔ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں عالم برزخ میں... میرا بیٹا اور چھوٹا بھائی اس آزار کا باعث ہیں۔“

نجابت علی خان کا چہرہ یکدم سفید پڑ گیا۔ کمال کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے ترکش کا یہ آخری تیر ان کے دل میں کسی تیز دھار خنجر کے پھل کی طرح پیوست ہو گیا ہے۔ وہ کسی شرابی کی طرح لڑکھڑائے اور کرسی پر دھپ سے بیٹھ گئے۔ ان پر رعشہ طاری تھا۔ کمال نے فوراً صراحی سے پانی کٹورے میں انڈیل کر دیا۔ انہوں نے خمیرہ ابریشم چاٹ کے پانی پیا اور خلا میں دیکھتے رہے۔ مطب میں ان کے سوا ابھی تک کوئی نہیں تھا۔ غالباً آج کل نسخے بھی وہی بناتے تھے۔

”چچی جان کیسی ہیں؟“ کمال نے آہستگی سے اپنائیت اور محبت سے بھرے لہجے میں پوچھا۔

”زندہ ہیں... سب زندہ ہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں مرا ہے۔“ نجابت علی خان جذبات سے عاری لہجے میں جواب دے کر سر ہلاتے رہے۔

کمال سمجھ گیا کہ سب سے مراد لالہ رخ تھی۔ اس نے جیسے اجازت لینے کے انداز سے پوچھا۔ ”کیا میں شام کو گھر آ جاؤں چچا جان؟“

نجابت علی خان نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کس لیے؟“

”آخر میرا بھی گھر ہے وہ؟“ کمال نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”تو پھر یہ سوال کیوں کیا تھا؟“ نجابت علی خان کا لہجہ یکدم بدل گیا۔

کمال کو اپنی کامیابی میں کوئی شک نہ رہا۔ وہ پُرامید ہو گیا اور خوشی چھپاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے مطب کا وقت ہے۔ اچھا اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ آداب!“

”جیتے رہو۔“ حسب عادت انہوں نے ہاتھ اٹھا دیا۔

یہ ایک میکانکی حرکت تھی جس میں جذبات کی رمق راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی تپش سے بھی کم تھی مگر کمال نے ٹاس جیت لیا تھا۔ اور وہ بیٹ لے کر دوسری اننگ کے کھیل کا آغاز کرنے کے لیے میدان میں اترنے کا حق حاصل کر چکا تھا۔

انتہائی سرد اور کشیدہ جذبات کی فضا میں کمال شام کے بعد اپنے چچا کے گھر پہنچا تو اسے باہر نشست گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ اس گھر میں کسی بھی وقت منہ اٹھا کے اندر جانے کا پرانا حق اسے ابھی نہیں ملا تھا۔ یہاں سب کچھ وہی تھا اور ویسا ہی تھا جیسا دو برس قبل تھا۔ پرانے صوفوں کی پشت پر لالہ رخ کی کشیدہ کاری سے مزین سفید غلاف نئے تھے۔ کروشیا سے بنے ہوئے میزوں کے سرپوش بھی نئے تھے۔ اس نیک پروین کے سگھڑپن، سلیقے اور امور خانہ داری میں مہارت کے نمونے نشست گاہ میں بھرے پڑے تھے لیکن یہ سب آؤٹ آف فیشن چیزیں اب کمال کو مضحکہ خیز لگتی تھیں۔ معلوم نہیں اب وہ پہلے کے مقابلے میں کتنی کالی اور موٹی ہو چکی ہے۔ گھر کے آنگن میں بندھی ہوئی بھینس ابھی تک ٹھیکرے کی منگنی سے منسوب خوابوں کی جگالی میں مصروف اسے خبر تو کل مل گئی ہو گی کہ گھر آنے والا وہی صبح کا بھولا ہے۔

چچا اور چچی کے نمودار ہو جانے سے اس کے خیالات کا تسلسل باقی نہ رہا۔ وہ ریت کے تودے کی طرح بکھر گیا۔ وہ سرعت سے اٹھا اور اس نے سر جھکا کے بڑے مؤدبانہ انداز سے چچی کو آداب کہا تو اس کا خیال تھا کہ چچی اس کی بلائیں لیں گی لیکن چچی نے جواب نہیں دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اپنے شوہر کے برعکس اس کا رویہ زیادہ جارحانہ ہے۔ وہ اپنے گھر میں کمال کو دیکھ کر بالکل خوش نہیں تھی لیکن شوہر کی وجہ سے سامنے آ گئی تھی۔

جب باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو سینے میں دبی ہوئی آگ کو نفرت کی ہوا نے بھڑکا دیا۔ چچی نے رو رو کر خوب کوسا۔ وہ گالیاں دیں جو ان کے خاندان کی زنانہ لغت میں شامل نہیں رہی تھیں۔ خود نجابت علی خان اس طرز تخاطب پر ندامت زدہ نظر آنے لگے۔ آج انہیں اندازہ ہوا تھا کہ ان کی بیگم اندر سے کتنی زخمی ہے۔ ان سے برداشت نہ ہو سکا تو انہوں نے اشارے سے چپ کراتے ہوئے کہا۔ ”بھئی بیگم۔ چلو ختم کرو اب پرانی باتیں۔ چھوٹے غلطی کرتے ہیں اور بڑے معاف کرتے ہیں کیونکہ ان کا دل بھی بڑا ہوتا ہے۔“

”دیکھو جی۔ میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا ہے۔ مجھ میں برداشت کا حوصلہ نہیں رہا۔“ چچی نے روتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تم ہی پوچھو کہ یہ کیا چاہتا ہے؟“

کمال منمنایا۔ اسے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا دل کی بات زبان پر لائے۔ پھر اس نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا۔ ”چچی جان! میں بس یہ چاہتا ہوں کہ سب پہلے کی طرح ہو جائے۔ یہ مقدمے بازی ختم...“

”مقدمے بازی کا ذمے دار کون ہے؟ ابتدا کس کی طرف سے ہوئی تھی؟“ چچی نے کہا۔ ”گھر کی بات کو ہم باہر لے گئے تھے کیا۔ خاندان کی ناک کٹ گئی۔“

”چلیے غصہ تھوک دیجیے۔ میں اعتراف کرتا ہوں اور نادم بھی ہوں کہ غلطی میری تھی۔“ کمال نے کہا۔ ”میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ بزرگ ہیں۔ دنیا میں آپ کے سوا میرا کوئی نہیں۔ آپ کبھی میرا حق نہیں مار سکتے۔ میں عدالت سے کیس واپس لے لوں گا غیر مشروط طور پر... میں سب کچھ آپ کے انصاف پر چھوڑ دوں گا چچا جان! اپنے مرحوم بھائی کی اکلوتی نشانی سمجھتے ہوئے آپ جو بھی دیں گے میں خاموشی سے قبول کر لوں گا۔“

”سنا تم نے بیگم جان!“ چچا کا چہرہ دمکنے لگا۔ ”اب تو معاف کر دو اسے سچے دل سے؟“

”بات معافی کی نہیں جی! اپنا گوبر سمیٹنے کی ہے۔ یہ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرے۔ ہمارا ہے تو ہمارا ہو جائے۔ پھر صرف حصہ کیا...؟ سب اسی کا ہو گا۔“

کمال کا دل ڈوبنے لگا۔ چچی اس کی توقع سے زیادہ چالاک اور شاطر ثابت ہو رہی تھی۔

”میں سمجھا نہیں چچی جان!“ اس نے بڑے بھولپن سے کہا۔ ”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

”تم اتنے بھولے نہیں ہو کمال میاں؟“ وہ براہ راست اس سے مخاطب ہو گئی۔ ”لیکن صاف سننا چاہتے ہو تو پھر صاف صاف سن لو۔ میں لگی لپٹی بات کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ہمارا اس دنیا میں ایک بیٹی کے سوا کون ہے اور وہ تمہاری امانت ہے۔ اپنی امانت سنبھالو اور ہمیں فارغ کر دو۔“

کمال کی سٹی گم ہو گئی۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ اتنا پرانا قصّہ پھر اٹھ کھڑا ہو گا جسے وہ اپنی دانست میں ختم کر چکا تھا۔ تاہم اس نے دور اندیشی اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے صورتحال کو خراب ہونے نہیں دیا۔ وہ بولا۔ ”اب مجھے شرم آتی ہے چچی! لیکن حقیقت چھپائی نہیں جا سکتی اور نہ ہی میں اسے چھپانا پسند کرتا ہوں۔ میں نے شادی کر لی ہے۔“

جیسا اس کا خیال تھا کہ یہ انکشاف چچی پر بم بن کر گرے گا۔ اس پر کوئی بم نہیں گرا نہ ہی چہرہ نفرت اور غصے سے سرخ ہوا۔ وہ اطمینان سے بولی۔ ”پھر کیا ہوا؟ مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے۔“

چچا کا سر پھر جھک گیا اور چہرے پر ندامت کی سرخی ابھر آئی مگر وہ بیوی سے ہمیشہ دبتے آئے تھے۔ کچھ بول نہ سکے۔ کمال کے ہاتھوں سے پھر طوطے اڑ گئے۔ وہ سنبھل کر بولا۔ ”چچی... دیکھیے... میں وعدہ کرتا ہوں کہ لالہ رخ کی شادی ضرور اور ہر قیمت پر ہو گی۔ رشتہ بھی مجھ سے بہتر ہو گا۔ آپ پریشان اور فکرمند نہ ہوں۔ اس کی شادی میری ذمے داری ہی نہیں بلکہ یہ میرا فرض ہو گا۔“

”نہ میاں! اپنا فرض اور اپنی ذمے داری ہم خود پوری کریں گے۔ اگر کہیں اسے ٹھکانے لگانا ہوتا تو کب کا لگا دیتے... مگر اس جائداد کی طرح لالہ رخ تمہاری ہے یا صرف ہماری۔ مسئلے کو قانونی سمجھو تو تمہاری مرضی۔ میں تو زبان اور شرع کی بات سمجھتی ہوں۔ میں صرف تمہاری خاطر عقد پر راضی ہوں۔“

”اسے مجبور مت کرو۔“ نجابت علی خان نے برہمی سے کہا۔

”مجھے سوچنے دیں۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو اور بات تھی۔“ کمال بولا۔

”ہاں ہاں... اس سے بھی پوچھ لو۔ نہ مانے تو پھر کبھی ادھر نہ آنا نہ خون کے رشتے کی بات کرنا۔“ چچی اک دم اٹھ کر سنسناتے تیر کی طرح اندر چلی گئی۔

”میں بھی چلتا ہوں۔“ کمال کھڑا ہو گیا۔ ”اجازت دیں چچا جان!“

چچا نے نیم دلی سے کہا۔ ”میاں! کھانا تو کھا کے جاؤ۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔“

وہ باہر آیا تو اس کی حالت پھٹنے والے پریشر ککر جیسی تھی۔ اس نے چچی کو ایک سو ایک گالیاں دیں۔ جائداد کے بدلے میں مجھے مانگتی ہے۔ خود کو لالہ رخ کے حوالے کرنے سے بہتر ہے کہ میں کالا پانی چلا جاؤں جسے دنیا میں کوئی قبول کرنے پر کسی قیمت پر تیار نہیں۔ اسے میرے سر منڈھنا چاہتی ہے اس کالی کلوٹی، بے کشش، بھینس اور بے انتہا بھدی لڑکی کو۔ اور پھر چچی نے شرم و حیا بالائے طاق رکھ دی اور کیسے منہ پھاڑ کے کہہ دیا کہ اسے دوسری بیوی بنا لو۔ آج شرع یاد آ گئی۔ لالہ رخ سے میں شادی کر کے دوسری لاتا تو نانی یاد آ جاتی۔

☆...☆...☆

اگلی ملاقات میں اس نے بلی تھیلے سے باہر نکال دی۔ چچی نے اسے دل بھر کے کوسا اور خاصی گالیاں دیں۔

”میں تو ایک باعزت اور پرامن فیصلہ چاہتا تھا۔ شادی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اپنے آپ سے کوئی دھوکا کر سکتا ہوں نہ لالہ رخ سے اور نہ ہی نورین سے...“ کمال نے صورت حال کے پرامن ہو جانے کے بعد کہا تھا۔

”نورین۔ وہی کلموہی۔ بھتنی۔ چڑیل۔“ چچی نے آنسو پونچھے۔

”خاصی گوری چٹی لڑکی ہے نورین۔ خیر۔ بات تھی سب کی عزت کی جس سے ہم کورٹ میں ٹینس کھیل رہے ہیں۔“ کمال نے کہا۔ ”کورٹ سے میری مراد ہے عدالت اور مقدمے بازی ایک میچ ہے جو بالآخر دونوں ہار جائیں گے۔ عزت کی گیند ادھر سے ادھر ہوتی رہے گی۔ تماشائی واہ واہ کریں گے یا پھر آوٴ... آوٴ...“

”مطلب کی بات کرو میاں اور چلتے بنو۔“ چچا نے کہا۔ ”کرکٹ چھوڑ کے کیا ٹینس شروع کر دی ہے جو ایسی مثالیں دے رہے ہو۔“

"مطلب کی بات... یہ ہے چچا نجابت کہ جائداد ہے تقریباً تیس لاکھ مالیت کی۔ اصولاً میرا حصہ بنتا ہے پندرہ لیکن میں آپ کو کچھ رعایت دے سکتا ہوں اگر آپ بھی عاقبت اندیشی کا ثبوت دیں اور اس معاملے کو باہمی طور پر عدالت کے باہر طے کرلیں۔"

"بہت خوب... اس رعایت کی نوعیت بھی بیان کردو۔" چچا نے طنز سے کہا۔ "مستحق اور حاجت مند تو ہم ہیں نا۔"

"ابھی میں جائداد کی مالیت بیس لاکھ فرض کرلیتا ہوں آپ اس کا نصف مجھے دے دیں اور مجھ سے تحریر لے لیں۔ سب جائداد آپ کی۔ مقدمہ ختم۔"

"یعنی دس لاکھ میں تم ہمیں بخش دوگے۔ ہماری عزت محفوظ رہے گی؟" نجابت علی خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بالکل... بال اب آپ کے کورٹ میں ہے۔" وہ پھر ٹینس کی مثال دے بیٹھا۔

نجابت علی خان کچھ سنجیدگی سے سوچتے رہے۔ "اچھا۔ تم بیٹھو۔ میں آتا ہوں دو منٹ میں۔"

چچی نے سیز فائر کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور کمال کے ساتھ اگلے پچھلے ہوتوں سوتوں کو بھی سچے دل سے بددعائیں دیں۔ کمال صرف مسکراتا رہا۔

چچا نمودار ہوئے تو ان کے ہاتھ میں نظر آنے والے کاغذ کے کرارے ٹکڑے کو پہچان کے کمال کے دل میں جشن فتح کے شادیانے بج اٹھے۔ یہ چیک تھا۔ شاید دس لاکھ کا۔ آٹھ یا سات لاکھ کا بھی ہو تو جزاک اللہ۔

"یہ لو میاں شہزادے! بال اب تمہارے کورٹ میں ہے؟" چچا نے چیک اسے تھما کر کہا۔

"پانچ لاکھ...؟" کمال نے چیک پر نظر ڈال کر مایوسی سے کہا۔

"ہاں۔ یہ پیشگی ہے یعنی بیعانہ۔" نجابت علی نے کہا۔ "دس لاکھ مانگے تھے تم نے تو میں نے یہ قیمت منظور کی۔ سودا منظور ہو تو شام کو آجانا۔"

"سودا کیسا...؟ کس چیز کی قیمت...؟" اس نے انہیں حیرت سے دیکھا۔

"یہ تمہاری... ایک ذلیل آدمی کی قیمت ہے۔" نجابت علی خان نے کہا۔ "منہ مانگی قیمت دے رہا ہوں تمہیں میاں! خاندانی آدمی ہوں۔ مول تول نہیں۔ شام تک چار دوستوں اور نکاح خواں کے ساتھ آجائو۔ نکاح کے بعد باقی ادائیگی ہوگی۔ بصورت دیگر میں صبح اس چیک کو بھی کینسل کردوں گا۔"

"میں نے یہ کب کہا تھا؟"

"ہاں تم اپنی کہہ چکے۔ اب میری بھی سنو۔" نجابت علی خان نے دروازہ کھول کے کہا۔ "آج کے بعد تم پر یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوجائے گا۔ سمجھے...؟ ہاں۔ عدالتوں کے سب دروازے کھلے رہیں گے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

کاغذ کا وہ پرزہ ایک طمانچہ تھا جو اس کے سابق چچا حکیم نجابت علی خان نے اس کے منہ پر کھینچ مارا تھا۔

"اور ہاں۔ اگر قوت خرید ہے تو تم بھی مجھے خرید کر دیکھو۔ یہی قیمت میں مانگتا ہوں اور باعزت فیصلے کی۔ دس لاکھ تم مجھے دو تو میں مقدمے سے ہی نہیں تمہارے بازاری خون کے رشتے سے ہی دستبردار ہوجائوں گا۔ مجھے اپنی عزت بہر حال عزیز ہے۔ یاد رکھنا میاں کمال! اب بال تمہارے کورٹ میں ہے۔"

کمال نے ایسی ذلت کا عذاب پہلے کبھی نہیں جھیلا تھا۔ وہ رات بھر سو نہیں سکا۔ اس نے چیک کو پرزہ پرزہ کردیا تھا اور پھر پرزوں کو جلا کر راکھ کردیا تھا۔ مگر وہ پرزے جیسے اس کے چاروں طرف جگنو بن کر اڑ رہے تھے اور اس کی ہنسی اڑا رہے تھے۔ معلوم ہوگئی اپنی اوقات؟ کیا ہو تم؟ محض ایک ذلیل آدمی برائے فروخت جس کی کل قیمت ہے دس لاکھ روپے۔ مگر خریدار صرف ایک ہے۔ وہ تم کو خرید سکتا ہے مگر تم... کنگال الزماں... ایک لڑکی کا دل جیت تو سکتے ہو اس لڑکی کو حاصل نہیں کرسکتے۔ بے زر عشق ٹائیں ٹائیں... چنانچہ بولو میاں مٹھو، منکہ کمال احمد ولد حکیم شرافت علی مرحوم خود کو بعوض دس لاکھ سکہ رائج الوقت... نصف موجل نصف غیر موجل... مسماۃ لالہ رخ بنت حکیم نجابت علی خان قبول کرتا ہوں۔

"نہیں... نہیں... نہیں۔" اس نے دیوانہ وار کمرے میں چکر لگاتے ہوئے اپنے بال نوچتے ہوئے چلا کے کہا۔ پھر لات مار کے اس نے میز گرادی اور بالآخر تھک کر بستر پر گرگیا۔

لعنت ہے ٹھیکرے کی منگنی کے نام پر میری قیمت کے خریدار... لالہ رخ پر اور اس کے باپ پر جو دس لاکھ میں میری محبت کو نیشنلائز کرکے اس پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتا ہے۔ فلمی فارمولے کے مطابق تو مجھے خود کو شراب میں غرق کرکے اپنا غم بھلا دینا چاہیے مگر یہ حرام شے بھی بلیک میں ملتی ہے اور جس فاقہ کش کو مرضِ عشق کی ہوا تک میسر نہ ہو اسے ایمان ضرور قبر میں سلامت لے جانا چاہیے۔

قبر کا خیال آیا تو وہ بھونچکارہ گیا اور سارے جسم میں لہو اس طرح سرد ہوگیا کہ وہ منجمد سا ہوگیا۔ کیا واقعی مایوسی کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں کہ خودکشی کے خیال نے میرے لاشعور میں جگہ بنالی تھی مگر مجھے علم نہ تھا۔ اتنی جلدی ہمت ہار گیا ہوں میں... ایک نوجوان ہوتے ہوئے۔ نہیں... بندے ایک در بند کرتے ہیں تو قدرت دس در کھولتی ہے۔ خوش قسمتی کے سات در ہوتے ہیں۔ بس مجھے سکون کی ضرورت ہے اور سکون تو ایک گولی سے بھی مل جاتا ہے۔ وہ فوراً نیچے اتر گیا۔ کیمسٹ نے اسے اوپر سے نیچے تک غور اور مشکوک انداز سے دیکھا اور بولا۔ "نسخہ ہے؟"

"نہیں... بس مجھے سکون کی ضرورت ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"نماز پڑھو اور دعا مانگو۔ خشوع و خضوع کے ساتھ۔" وہ ناصحانہ انداز میں بولا۔

"میں خطبہ سننے نہیں آیا۔ گولیاں دوگے یا نہیں؟" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"نہیں۔ ذرا اپنی صورت دیکھو۔ حرام موت مرگئے تو گناہ مجھے بھی ہوگا۔ لوگ نشے کے طور پر بھی گولیاں کھاتے ہیں۔ تم مجھے اپنے ساتھ مارنا چاہتے ہو؟" وہ بگڑ گیا۔

کمال مایوس ہوکر لوٹ گیا۔ دو ایک میڈیکل اسٹور والوں نے بغیر نسخے کے گولیاں دینے سے معذرت کرلی۔ جیسے وہ کوئی ہیروئنچی ہو۔ پھر اسے ایک واقعہ یاد آیا۔ دو برس قبل اس کی گلی میں ایک گھر میں ایک بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ محلے کی لیڈی ڈاکٹر نے مارفیا کا انجکشن منگوایا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس مشکل کو ایک ہیروئنچی نے حل کیا اور بیس منٹ میں اس نے مارفیا کا انجکشن فراہم کردیا تھا۔

گھر واپس آنے کے بعد اس نے میڈیکل اسٹور والے کو خوب کوسا۔ جب اس کا غصہ سرد پڑ گیا تو ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی بار وضو کیا اور جانماز بچھا کر قبلہ رو ہوگیا۔ جبکہ یہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا مگر عبادت کا نذرانہ عقیدت سے پیش کیا جائے تو اللہ کسی بھی وقت شرف قبولیت دینے سے انکار نہیں کرتا۔

کمال کو نہ صرف بے حد خوشی ہوئی بلکہ یہ امر انتہائی تعجب خیز ہوا جب دعا مانگنے کے بعد اس کا دل واقعی پُرسکون ہوگیا۔ قلب کی طمانیت کے ساتھ ساتھ اس کی روح کو جو ایک عجیب سی فرحت اور راحت ملی وہ اس کے وہم و گمان میں نہ تھی۔ اسے نورین، ساری جائداد اور ساری دنیا کی دولت بھی مل جاتی تو ایسی خوشی اور سرشاری محسوس نہ کرتا جو رب العزت سے مانگنے سے عطا ہوئی تھی۔ اس نے کوئی لمبی چوڑی دعا بھی نہیں مانگی۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ میرے اللہ میری مدد کردینا، تیرے سوا میرا کوئی مددگار اور رحیم و کریم نہیں ہے۔ اس نے دکھی اور سچے دل سے اسے پکارا تھا۔ اس کی دعا مستجاب ہوئی۔

پھر وہ سوگیا اور صبح سویرے تک سوتا رہا۔ کچھ دنوں سے اس نے یہ معمول بنالیا تھا کہ وہ دروازہ باہر سے مقفل رکھتا تھا۔ خود کھڑکی کے راستے اندر جاکے کنڈی لگالیتا تھا۔ اس نے تین مہینے سے مالک مکان کو کرایہ نہیں دیا تھا اور اسے فریب دینے اور اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا یہ طریقہ بہت موثر ثابت ہورہا تھا۔ اسے کئی بار مالک مکان کے تحریری پیغامات ملے تھے جو اس نے دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دیئے تھے۔ ان سب کا موضوع ایک ہی تھا مگر مضمون روز بروز سخت ہوتا جارہا تھا۔

ایک روز وہ صبح ڈرتے ڈرتے ایس پی عبدالخالق کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملامت سے بولا۔ "سر! آئی ایم سوری۔ ابھی تک میں کچھ نہیں کرسکا۔"

"تم کچھ کروگے بھی نہیں؟ کیوں کہ تم کرنا نہیں چاہتے۔" آج اس کا لہجہ یکسر بدلا ہوا اور تند سا تھا۔ "تم نے سوچ لیا تھا کہ زندگی پھولوں کی سیج ہے جو ہنستے کھیلتے ہی گزر جائے گی۔ چوکے چھکے مار کے، وکٹیں اڑا کر، مین آف دی میچ بن کر سب ملتا رہے گا۔ پیسہ بھی اور نورین جیسی بے وقوف لڑکیاں بھی... اس سے زیادہ عیش کسی اور پیشے میں کہاں؟ چالیس برس پہلے ہی آدمی ریٹائر ہوجاتا ہے مگر اس سے پہلے بہت مالدار گھرانے کی لڑکی سے شادی کرکے تو مستقبل محفوظ ہوجاتا ہے۔"

"لعنت ہے ایسی دولت پر..." کمال بھڑک اٹھا۔ "اپنے پاس رکھیں آپ اپنی دولت... ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے مجھے۔"

"نورین کو تو چاہیے۔ اتنی بدنامی اور اتنا خطرہ مول لے کے میں نے جو کچھ کمایا ہے وہ کیا میں اپنے ساتھ قبر میں لے جائوں گا؟ وہ تو جہنم کے انگارے ہیں۔" وہ طنز سے مسکرایا۔ "ہر شخص اولاد کے سکھ کے لیے کماتا ہے اور انہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ تمہاری اتنی حیثیت نہیں پانچ لاکھ بھی اکٹھا کرسکو۔ میرا سب کچھ نورین کے لیے ہے۔ اس کے بھائی بھی بہت اچھا کمارہے ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ کمالیں گے۔"

"میں بھی تو سر توڑ کوشش کررہا ہوں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تھوڑی بیٹھا ہوں۔"

"کب تک کوشش کروگے آخر...؟ میں نورین کو تمہاری کامیابی کے انتظار میں کب تک بٹھائے رکھوں؟ تم اپنی خاندانی حویلی کا مقدمہ لڑتے لڑتے مزید قلاش ہوجائوگے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم تمام عمر نورین پر بوجھ بنو۔ میں اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"آپ مجھے ایک اور موقع دیں سر! پلیز!" وہ جیسے گڑگڑایا۔

"ٹھیک ہے۔" ایس پی عبدالخالق نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لیکن اب میں تمہیں ڈیڈ لائن دے رہا ہوں۔ اس سال کے ساتھ ہی تمہارا چانس ختم ہوجائے گا۔ تین مہینے سے زیادہ وقت ہے تمہارے پاس۔ کہیں قدم جم جائیں تو مجھے بتانا اور ہاں اس خوش فہمی کو دماغ سے نکال دینا کہ نورین عاقل و بالغ ہے اس لیے اپنی مرضی سے شادی کرسکتی ہے مگر میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔"

نورین نے ہاتھ جوڑ کے اسے کہا تھا کہ وہ برداشت کرے۔ اس کا باپ جائز ناجائز کچھ بھی کہے بس سنتا رہے۔ اس لیے وہ چپ چاپ ضبط و تحمل سے سنتا رہا۔ برداشت کرتے کرتے کمال کے اعصاب کی چٹنی بن گئی تھی۔ اس کے ساتھ تقدیر نے جو کچھ کیا وہ سب اسے برداشت کرنا پڑا تھا۔ کرکٹ سے دوری اور بے روزگاری کو اس نے نورین کی خاطر برداشت کیا تھا مگر اب معاملات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ جہاں وہ نورین کی محبت کو بھی برداشت کررہا تھا۔ مایوسی کے حصار میں باغیانہ خیالات کا بگولا جب بھی اٹھتا تھا وہ شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ دبا لیتا تھا پھر طوفان کی طرف پیٹھ کرلیتا تھا لیکن طوفان کی شدت بڑھتی جارہی تھی اور اس کے قدم اکھڑنے لگے تھے۔

نورین کے باپ کا نوٹس ملتے ہی کمال پر چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔

اب اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اور نورین چھپ کے شادی کر لیں؟ اس نے سوچا۔ پھر عدالت میں حاضر ہو کے بیان دے دیں کہ ایس پی عبدالخالق سے انہیں کس قسم کا خطرہ لاحق ہے۔ اس حکمت عملی نے کمال کو نئی راہ دکھائی۔ اس نے نورین سے ملاقات ہوتے ہی اپنا آئیڈیا اس کے سامنے رکھ دیا۔ نورین ناگواری اور بڑی خاموشی سے سنتی رہی اور پھر اس نے کہا۔ ”یعنی تم چاہتے ہو کہ پھر سے کرکٹ کھیلو تاکہ سپر اسٹار کھلاڑی بن جاؤ اور ٹیسٹ کیپ حاصل کر کے دم لو۔“

”یار! تمہارا باپ تو پاگل ہے... تم بھی پاگل ہو گئی ہو کیا...؟ کرکٹ کھیلنا ایک خداداد صلاحیت ہے اور اس سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ کچھ اور نہیں کر سکتا تو کرکٹ کیوں نہ کھیلوں؟ یہ کوئی جرم ہے یا کوئی غیر اخلاقی بات؟ ہمارا ملک...“

”وہ سب مجھے معلوم ہے... مگر تمہیں یقین ہے کہ تم پھر کامیاب ہو جاؤ گے اور وہی مقام حاصل کر لو گے؟“

”مجھے یقین ہے... بس کوشش کرنے کی شرط ہے۔ کامیابی ضرور میرے قدم چومے گی۔ صرف ایک مہینے کی نیٹ پریکٹس میں میری فارم واپس آ جائے گی۔ ادارے خود بخود بلائیں گے مجھے... انہیں ضرورت ہوتی ہے اچھے کرکٹر کی... ! میں احمق تھا کہ میں نے عزت، شہرت اور دولت کو لات مار دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ کوئی منشیات کے حوالے سے مشہور گولڈن ٹرائی اینگل نہیں تھی۔ میں نے تین ماہ سے فلیٹ کا کرایہ ادا نہیں کیا۔“ اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ کس طرح مالک فلیٹ سے منہ چھپاتا پھر رہا ہے۔

”تمہیں اس بات کا اندازہ تو ہو گا کہ میرے ڈیڈی کا ردعمل کیا ہو گا؟“ نورین نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”تمہیں اچھی طرح علم ہے نا...؟“

”معلوم ہے مگر تین مہینے سے پہلے وہ تمہاری شادی نہیں کر سکتے...“

”کیوں نہیں کر سکتے...؟ جب تم بدعہدی کرو گے تو وہ بھی کسی معاہدے کے پابند نہیں رہیں گے۔“

”چلو۔ پھر ہم شادی کر لیتے ہیں۔ ابھی اس کا اعلان نہیں کرتے... جب میں کامیاب ہو جاؤں اور وہ تمہاری شادی طے کرنے لگیں تو انہیں بتایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک خودکش دھماکا ہو گا... مکمل رازداری کے ساتھ...“

”دیکھو میرے پیارے کمال... ! مجھے جتنا تمہارا خیال ہے، اتنا ہی اپنے ڈیڈی کی عزت کا بھی... کرکٹ کے معاملے میں ان سے اختلاف کرنا ناممکن ہے۔ ساری دنیا انہیں قائل کر سکتی ہے کہ یہ شادی غلط نہیں لیکن چھپ کر شادی کرنے کا کوئی جواز نہیں... تم اپنی پرانی پوزیشن حاصل کر لو۔ شادی کا کیا ہے، وہ ایک گھنٹے میں ہو جائے گی اور ڈیڈی کو قبول کرنا پڑے گی۔ تین مہینے بعد میرے پاس دلیل ہو گی کہ تمہاری کامیابی کی، عزت اور شہرت کی۔ آج ڈیڈی تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ جب تم بینک میں اے وی پی تھے تو تمہاری ایک حیثیت تھی۔“

”اس وقت تم نے ہی کہا تھا۔“ کمال نے برہمی سے کہا۔

”ہاں... مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم کچھ اور نہیں کر سکتے۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتی ہوں۔ لو یہ پیسے رکھو۔ فلیٹ کا کرایہ ادا کرو تاکہ رہنے کو جگہ تو ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ تین ماہ...“ اس نے رقم لینے کے لیے غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھا دیا۔ رقم لینے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ نورین نے جیسے اسے ذلت سے بچا لیا تھا۔ مالک مکان سے سامنا ہوتا تو جانے وہ اسے کس طرح ذلیل کرتا۔ کرایہ نہ ملنے کی صورت میں اس کا گریبان پکڑ لیتا۔ ”کرایہ ادا ہو جائے گا مگر نئے سال کے ساتھ ہی ہم دونوں ایک ہو جائیں گے اور تم اس وعدے پر ایک چٹان کی طرح قائم رہنا؟“

☆...☆...☆

اپنے چھوڑے ہوئے نقش قدم پر الٹے پاؤں جانا آسان نہ تھا۔

کمال نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک وسیلہ تلاش کیا اور رازداری سے مختلف مراحل طے کرتا ہوا دوسرے بینک کے نائب صدر کا وقت لینے میں آخرکار کامیاب ہو گیا۔ خلافِ توقع اس کی پذیرائی بھی ہوئی جس کی اسے ذرہ برابر امید نہیں تھی۔

”ہم ضرور خوش آمدید کہیں گے۔ لیکن یہ مسئلہ تمہارا ہے کہ تم جگہ بنا سکتے ہو یا نہیں؟ مستقل ٹیم سے کسی کو ڈراپ کرنا آسان نہیں، اس طرح بینک کا میچ خراب ہوتا ہے۔“ اسپورٹس کے انچارج نائب صدر نے کہا۔

”میں ان تمام اسرار و رموز کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ کمال نے جواب دیا۔

”آئی ایم سوری... ! تم نہیں سمجھتے... سمجھتے تو پہلا غلط فیصلہ ایسے غلط وقت پر نہ کرتے۔ تم نے اپنی ٹیم کو بحران میں مبتلا کر دیا تھا وہ بھی کسی وجہ کے بغیر۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے۔ اب اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم آئندہ قابل اعتماد ثابت ہو گے۔“

”آدمی ایک غلطی دوبارہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے ٹھوکر لگ چکی ہوتی ہے۔“

”کچھ لوگ اس سے سبق حاصل نہیں کرتے۔ خدا کرے آئندہ غلطی تم نہ کرو۔ دو ہفتے بعد ایک نمائشی میچ ہے۔ اس میں تمہاری پرفارمنس دیکھیں گے۔ پھر فیصلہ کریں گے۔ ٹھیک ہے؟“ نائب صدر نے خوش اخلاقی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”گڈ لک...“

”تھینک یو سر! لیکن کیا میں نیٹ پریکٹس کے لیے آ سکتا ہوں؟“ کمال نے پوچھا۔

”تم کوچ سے مل لو۔“

کوچ حد درجہ خردماغ ثابت ہوا۔ جو باتیں نائب صدر نے شائستگی سے کی تھیں، وہی اس نے بدتمیزی سے دہرائیں اور اسے خاصا بے عزت کرنے کے بعد ترس کھاتے ہوئے اجازت مرحمت فرما دی کہ اچھا آ جانا شام کو۔ دیکھیں گے۔

نیٹ پریکٹس کرنے والوں کا رویہ بھی کم جارحانہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کمال کا آ جانا کسی کے جانے کی گھنٹی ہے۔ خطرے کی یہ گھنٹی سب ہی سن رہے تھے مگر وہ زیادہ پریشان تھے جو نووارد تھے اور ابھی اپنی صلاحیت منوانے کی منزل میں تھے۔ ان سب نے ٹیم اسپرٹ کے انداز میں دفاعی حکمت عملی اختیار کر لی اور کمال کو پریکٹس کا موقع یوں دیا کہ اس کا اور اپنا وقت ضائع کیا۔ فضول ترین باؤلرز نے جو حقیقت میں بیٹسمین تھے، اسے فضول گیندیں کرائیں۔ وہ خون کے گھونٹ پی کے برداشت کرتا رہا۔ پہلے ہی دن وہ اس متحدہ محاذ کے خلاف اعلان جنگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کچھ سینئر پلیئرز سے شکایت کی جو کبھی اس کے ساتھی تھے مگر انہوں نے بھی آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیا۔ جو ٹیم سے باہر ہو گیا، وہ باہر ہو گیا۔ جو اندر رہے، وہ اندر ہے۔ سب کا ساتھی ہے اور سب اس کے ساتھ ہیں۔

زیادہ خرابی اگلے دن ہوئی جب ایک اسپورٹس رائٹر نے کمال سے منسوب بیان اخبارات میں شائع کرا دیا۔

”کمال احمد کی کرکٹ میں واپسی یقیناً پرانے مداحوں کے لیے باعث مسرت ہو گی۔ اسپورٹس افیئرز کے انچارج سے ملاقات کے بعد کمال احمد نے بتایا کہ نائب صدر کو یقین ہے کہ اس سال بھی ٹرافی ان کے پاس رہے گی۔ انہوں نے گزشتہ سال ٹرافی حاصل کرنے میں کمال احمد کے تعاون کی بھی تعریف کی۔“

اس بیان نے دونوں طرف آگ لگا دی۔ کمال جس بینک کی طرف سے کھیلتا تھا، اس کے صدر نے دوسرے بینک کے صدر کو فون کر کے کہا۔ ”ویری گڈ... تو یہ تم تھے جس نے کمال کو فائنل میں کھیلنے نہیں دیا تھا۔ کتنی رشوت دی تھی تم نے اسے ٹرافی اٹھانے کے لیے؟“

”یہ بکواس ہے... ہم کرکٹ کھیلتے ہیں۔“ اس نے بڑی ترش روئی سے جواب دیا۔

”یہ تو کرکٹ نہ ہوئی...؟“ یہ کہہ کر پہلے صدر نے فون بند کر دیا۔

دوسرے بینک کے صدر نے نائب صدر کو طلب کر لیا۔

”کیا یہ بات آپ نے کہی تھی...؟ کیا مطلب ہے آخر اس ”تعاون“ کا جو کمال سے منسوب کیا گیا ہے؟“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اس سے... وہ خود آیا تھا میرے پاس سر کے بل ملازمت کے لیے اور میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ سوری... ہمارے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں اور ویسے بھی ہم اس پر بھروسہ کیسے کر سکتے ہیں۔“

”پھر کیا یہ اسپورٹس رائٹر جھوٹ بولتا ہے؟ اسے اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”کمال نے اس سے جو کچھ کہا وہ اس نے من و عن چھاپ دیا۔ کیا میں نوٹس دوں اخبار کو یا تردید کافی ہو گی؟“

”نوٹس ضرور دو۔ یہ نہایت ضروری ہے۔“

کمال کی کسی نے نہیں سنی۔ اسپورٹس کے انچارج نائب صدر نے اسے گالیاں دے کر عملاً باہر پھنکوا دیا۔ کمال، ذلت کے بعد مشتعل ہو کر اپنے پرانے بینک پہنچا اور کسی نہ کسی صورت بینک کے صدر کو چند منٹ کی ملاقات پر راضی کر لیا۔

”بولو...“ اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”دو منٹ میں سب کچھ کہہ دو۔“

”سر... یہ جھوٹ ہے۔ اسپورٹس رائٹر نے بکواس کی ہے۔“

”اوکے... اور کچھ...“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”جس طرح تم عین وقت پر ہم سے دغا کر گئے تھے، وہ تو جھوٹ نہیں تھا؟“

”سر... ! وہ میری مجبوری تھی۔“ اس نے خجالت سے کہا۔ ”غلطی تھی جس پر میں شرمسار ہوں۔“

”پھر میں کیا کروں؟“ اس نے کندھے اچکا کر گھنٹی بجائی۔ ”تم جا سکتے ہو... بائی داوے... کتنی رقم ملی تھی تمہیں فائنل میں نہ کھیلنے کی، کیا وہ سب تم نے اڑا دی...؟“

کمال نے آخری کوشش کی کہ اسپورٹس رائٹر اپنے بیان کی تردید کر دے مگر اسے ناکامی ہوئی۔ کسی نے بڑی ہوشیاری سے اس کے خلاف سازش کی تھی اور وہ ہر طرح سے کامیاب ہو گیا تھا۔

کمال کس کس سے لڑتا۔ اسے ہر صورت کرکٹ سے باہر رکھنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ یہ کرکٹ کی دنیا میں کوئی پہلا سانحہ نہیں تھا اس سے پہلے کئی ہیروز کو اسی طرح کلین بولڈ کر دیا گیا تھا۔ بیان بازی، قانونی نوٹس، مظاہرے، جلسے اس فیصلے کو بدل نہیں سکتے تھے۔ یہ بات ایس پی عبدالخالق نے کمال کو بہت پہلے سمجھا دی تھی۔

ایک ہفتے پہلے کمال نے جو سہانے خواب دیکھے تھے، وہ سب چکنا چُور ہو گئے تھے۔ تین مہینے تو ابھی بہت دور تھے۔ نیا سال آنے تک ابھی بہت کچھ ہونا باقی تھا۔ جس کا کمال کو اندازہ نہ تھا۔ جب ستارے گردش میں ہوں تو آدمی کی کوشش بھلا کیا کر سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ نورین سے ملتا اور گردش حالات کی پیدا کردہ صورتحال کے پیش نظر وہ دونوں کچھ سوچتے۔ کوئی نیا لائحہ عمل تیار کرتے۔ نورین کے باپ کو زیر دام لانے کی کوئی ترکیب نکالتے یا وہ اپنے چچا سے نمٹنے کے لیے کچھ کرتا کہ بد بختی کے آخری تیر نے اس کا کام تمام کر دیا۔

اچانک اور غیر متوقع پولیس نے اسے صبح صبح گرفتار کر لیا۔ تھانے پہنچ کر اسے علم ہوا کہ اس نے لالہ رخ کو قتل کر دیا ہے۔ وجۂ قتل واضح تھی۔ دونوں خاندانوں کے درمیان خون کا رشتہ، خون کی پیاس میں بدل چکا تھا۔ ان کے درمیان جائداد کی مقدمے بازی جاری تھی اور کمال نے حال ہی میں چچا کے گھر جا کر انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے تصفیہ نہیں کیا تو ان کے حق میں بہت برا ہو گا۔ وہ ان سے زبردستی پانچ لاکھ روپے کا چیک بھی لکھوا کے لے گیا تھا جو اگلے ہی روز انہوں نے کینسل کر دیا تھا۔ بینک کو لکھا ہوا خط ایک تحریری ثبوت تھا۔ چچا نے لکھا تھا کہ ان کا ناہنجار بھتیجا گن پوائنٹ پر پانچ لاکھ روپے کا چیک لے گیا تھا۔ اسے منسوخ تصور کیا جائے۔ خط میں چیک نمبر بھی تھا اور تاریخ بھی۔ درگزر سے کام لیتے ہوئے چچا نے اس وقت پولیس کو مطلع کرنا مناسب خیال نہیں کیا تھا۔

پولیس کے پاس وجۂ قتل بھی تھی اور مجرم کے خلاف واقعاتی شہادت بھی... صرف آلۂ قتل کا مسئلہ تھا تو وہ کہیں سے بھی برآمد کیا جا سکتا تھا جو پولیس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چٹکی بجانے کی دیر تھی۔ پولیس نے اسے دو دن مہمان رکھا اور پھر عدالت کے روبرو پیش کر کے مزید چودہ دن کا جسمانی ریمانڈ لے لیا۔ کمال کو پورا یقین تھا کہ اس مشکل وقت میں نورین اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی۔ وکیل کی ضرورت کا مرحلہ ہنوز دور تھا۔ تفتیش کا جان لیوا عمل ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ وہ بہت چیخا چلایا کہ وہ بے گناہ ہے مگر پولیس یوں اعتبار کرنے لگے تو عدالتوں کا سارا کام ٹھپ ہو جائے۔ ملزم تھانے سے خوش خوش گھر جائیں اور جج سارا دن مکھیاں مارتے نظر آئیں۔

پولیس کا ریکارڈ ایک ہی جگہ کسی اڑیل گھوڑے کی طرح اڑ گیا تھا۔

”قتل کیسے کیا...؟ کب کیا...؟“

ہر رات بڑی باقاعدگی سے اسے الٹا لٹکاتے اور تشدد کی سائنس کا نیا عملی تجربہ کرتے ہوئے بس یہی پوچھتے تھے۔ ”ڈرائنگ روم“ میں اس کے علاوہ بھی مہمان ہوتے تھے۔ کچھ اس سے پہلے اور کچھ بعد میں تفتیش کے عمل سے گزرے تو ان کا تڑپنا اور پھڑکنا دیکھ کے جسے پولیس والے ڈانس کہتے کمال پر کپکپی طاری ہوتی رہتی تھی۔ اس کا سارا بدن بری طرح سوج گیا تھا۔ ہر جگہ نیل ہی نیل پڑے تھے۔

وہ کوشش اور تکلیف کے باعث سیدھا نہیں چل سکتا تھا۔ ایک قدم چلنا بھی سخت دشوار معلوم ہوتا تھا۔ استنجا کے لیے بیٹھتا تو اس کی دلخراش چیخیں نکل جاتی تھیں۔ کروٹ لیتا تو اس طرح ہائے ہائے کرتا جیسے اس کی پسلیاں توڑ دی گئی ہوں۔ وہ جو ایک بینک میں اے وی پی تھا، فاسٹ بولر تھا، چھکے مار بیٹسمین تھا، اب حوالات میں عام چوروں، جیب تراشوں، لاوارثوں اور ناکردہ گناہوں کی سزا پانے والے بدبختوں کے درمیان گھر گیا تھا۔ وہ فرعونوں، ہلاکو اور چنگیز خان کی اولادیں اور خون آشام بھیڑیوں سے کہیں سفاک اور ایذائیں دینے میں ماہر اور جلاد فطرت کے مالک تھے۔ ان میں جو بچا تھا وہ انہی کے جیسا ملزم تھا جسے نہ کوئی جانتا تھا اور نہ پہچانتا تھا۔ مستند قسم کے مجرم اس کے سامنے لائے گئے اور ان کے ورثاء نے انہیں تفتیش سے بچانے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ بیویوں اور ماؤں، بہنوں نے اپنے زیور بیچ کے انہیں تشدد سے محفوظ رکھنے کے علاوہ گھر سے کھانا فراہم کرنے اور ملاقات کرنے کی سہولت حاصل کر لی۔ وہ رشوت خور جن کا کوئی ضمیر نہیں تھا۔ وہ یہ بھول جاتے تھے ایک ہستی ایسی ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور اس کے سامنے ایک روز جواب دہ ہونا ہے۔ بہت سے تھانیدار نے ذاتی اختیار کی قیمت وصول کر کے چھوڑ دیے۔ کچھ بہت اوپر کی سفارش پر بچ گئے۔ معمولی سفارش تو الٹے گلے میں پڑ جاتی تھی۔ جو مجرم کسی قیمت پر چھوڑے نہیں جا سکتے تھے، وہ پکا پرچہ کاٹ کے عدالت بھیج دیے گئے اور وہاں سے جیل چلے گئے۔

کمال کے علاوہ صرف ایک ملزم تھا جو کچھ قبول کرنے پر کسی قیمت پر آمادہ نہ تھا اور وہ اتنا ہی لاوارث بھی تھا۔ اس کی اللہ نے سنی اور بالآخر اس کا نجات دہندہ فرشتۂ اجل بنا۔ اس کا جسم انسانی فلاح کے لیے میڈیکل سائنس کے طلباء کے سپرد کیا گیا۔

”ہاں بھئی تو بھی تیار ہو جا... ڈھیٹ ہڈی...“ تھانیدار نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ ”اب تیری رخصتی ہے۔ بڑا اسپیشل فارمولا ہے۔ اسے آزمائیں گے آج!“

کمال یہ سن کر کانپنے لگا۔ اس کی حالت اس مجرم کی سی ہو رہی تھی جسے پھانسی دینے کے لیے تختۂ دار کی طرف لے جایا جائے گا۔ اگر اسے پھانسی دی جانے والی ہوتی تو وہ اس قدر دہشت زدہ اور بے جان نہ ہوتا۔ کیونکہ اسے ہلاکو کی ناجائز اولاد جو ایذائیں دیتے، اس کے مقابلے میں موت لاکھ درجے بہتر ہوتی تھی جو نہیں آتی تھی۔

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں لہو کی ایک بوند بھی باقی نہیں رہی ہے۔ آنسو خشک ہو چکے تھے اور چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا لیکن اس روز اچانک تھانے میں اس طرح افراتفری پھیل گئی تھی جیسے خودکش حملہ ہو گیا ہو۔ بڑی عجلت میں اسے حوالات سے نکال کے ایک گرم حمام میں پہنچایا گیا۔ اس کی شیو بنائی گئی اور بال بھی بڑی نفاست سے ترشوائے گئے۔ جسم پر نہ جانے کیا کیا باڈی لوشن مل کے خوشبودار پاؤڈر تھوپا گیا اور اسے بار بار گلوکوز ملا ہوا دودھ پلایا گیا۔ ہر چار گھنٹے کے بعد دو گولیاں دی گئیں جس سے درد کا احساس ختم ہو گیا۔ شام کو ایک ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور اسے دوا انجکشن لگائے۔ رات کو اسے سونے کے لیے چارپائی ملی جس پر آرام دہ بستر اور کمبل بھی تھا۔ سونے سے پہلے چکن بروسٹ، چکن تکہ اور بریانی کھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”کیا صبح مجھے پھانسی ہو جائے گی؟“

ڈیوٹی پر مامور کانسٹیبل جس کا چہرہ مہرہ کسی وحشی قاتل کی طرح تھا وہ قہقہہ مار کے ہنسا اور اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ”پاگل دے پتر...! ایس پی صاحب کے سامنے پیشی ہے تیری... کیا تجھے معلوم نہیں...؟“

”کون ایس پی...؟“ کمال نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اپنے ایس پی عبدالخالق صاحب اور کون؟ تو نہیں جانتا انہیں...؟“

جب ایس پی عبدالخالق آیا تو اس طرح آیا جیسے تھانے میں زلزلہ آ گیا ہو۔ کمال کو اس کے روبرو پیش کیا گیا تو کمال نے اس کے سامنے آشنائی کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ اس کی نظر میں اجنبیت تھی۔

”کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی اس کے ساتھ...؟“ ایس پی عبدالخالق نے تھانیدار سے پوچھا۔

”بالکل نہیں سر...!“ ایس ایچ او نے بڑے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ دیکھ سکتے ہیں کتنا ہٹا کٹا اور تر و تازہ نظر آ رہا ہے۔ کیوں بھئی ٹھیک ہے نا؟“

کمال نے میکانکی انداز میں سر ہلا کے تائید کی۔ ”یہ ٹھیک فرما رہے ہیں۔“

”کھانے کو بھی اچھا دیا، لمبی تان کے سویا۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا...؟“

کمال نے زبان سے کچھ نہیں کہا صرف سر ہلا دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایس پی آج کیوں آیا ہے اور یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ چند لمحوں کے بعد وہ اپنی جیپ میں بیٹھ کے چلا جائے گا تو پھر وہ انہی کے رحم و کرم پر ہو گا جن کے ساتھ وہ سولہ دن یا سولہ برس سے تھا۔

”سوال و جواب تو کرنے تھے سر! ضابطے کی کارروائی تھی...“

”ہاں... مگر یہ بے قصور ہے۔ اسے جانے دو۔“ یہ کہہ کر ایس پی عبدالخالق اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی ٹوپی سر پر جمائی۔ ڈنڈا بغل میں دبایا اور ایڑیوں کی کھٹا کھٹ والے سیلوٹ کا جواب ایک شانِ استغنیٰ سے دیا اور جیپ میں جا بیٹھا۔ کمال اس طرح بت بنا کھڑا رہا۔ اگر اس کی سانس چل نہ رہی ہوتی تو اس پر پتھر کے کسی مجسمے کا دھوکا ہوتا۔

تھانیدار نے واپس آ کر اس کی گردن ناپی اور اسے بے رحمی سے باہر دھکیل کر کہا۔ ”چل دفع ہو۔“

اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ تھانیدار نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا کہ کہیں ڈی آئی جی کا فون نہ ہو۔

”ہیں جی...! ہاں جی...! ابھی ابھی گئے ہیں ایس پی صاحب... دو منٹ بھی نہیں ہوئے۔ آپ کون ہیں بی بی! اچھا... اچھا جی... گھر سے بول رہی ہیں... جی بیگم صاحب...! ملزم... ملزم ابھی ہے جناب...!“ پھر تھانیدار نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”او... حلال حرام... ادھر مر آ کر۔“

کمال نے ریسیور تھام لیا۔ تھانیدار نے دانت پیس کے کہا۔ ”بول نا منہ سے...“

”ہیلو جی...“ کمال نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا جو ہرگز اس کی نہیں تھی۔

”کمال...! تم کمال ہو...؟ کمال احمد ہو نا؟“ ادھر سے پوچھا۔

”ہاں جی... آپ کون ہیں؟“ کمال صرف سولہ دن میں تابعداری سیکھ گیا تھا۔ ”حکم کریں۔“

”مجھے بہت افسوس ہے کمال...! پانچ لاکھ کی رقم حاصل کرنے کا کیا یہی طریقہ رہ گیا تھا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ تم ڈاکا ڈالتے۔ میری ایک درخواست ہے۔“

”حکم کریں بیگم صاحب!“

”دیکھو اس لہجے میں بات مت کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم آئندہ کسی کے سامنے میرا نام لو یا میرے حوالے سے کوئی بات کرو... ہم ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے... تم سمجھ رہے ہو نا میری بات... میں نہیں چاہتی کہ تم پر کوئی برا وقت آئے... سب سے اچھا تو یہ ہے کہ تم اس شہر سے چلے جاؤ لیکن نہ جا سکو تو کبھی بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ میری شادی ہو چکی ہے اور میرا شوہر اے ایس پی ہے... اس کی پوسٹنگ اندرون سندھ میں ہے مگر ڈیڈی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ یہاں آ جائے۔ وہ ویک اینڈ پر آ جاتا ہے مگر...“

کمال بات ختم ہونے پر بھی ریسیور تھامے کھڑا رہا۔

☆...☆...☆

زندگی اس کے لیے ایک بددعا ہو گئی تھی اور وہ محض ایک تماشائے عبرت بن کے جینا نہیں چاہتا تھا۔ تھانے سے نکل کر وہ بے مقصد گھومتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خلا تھا اور مستقبل اس کے لیے اتنا ہی بے وجود تھا جتنا اس کا ماضی... وہ کمال احمد جو کسی لالہ رخ کا منگیتر تھا یا کسی نورین کو چاہتا تھا ایک بھولی بسری داستان ہو گیا تھا۔ کرکٹ کا نام اس کے لیے اتنا ہی اجنبی تھا جتنا کھیل کا نام... اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ دوست نہیں تھا اور آشنا نہیں تھا۔

ایک رات اور دو دن وہ کھائے پیئے بغیر چلتا رہا۔ دوسری رات آئی تو وہ سڑک پر گر کے بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ کسی گھر میں تھا۔ ایک آرام دہ بستر اور ایک خاصے آراستہ پُر تکلف کمرے میں تھا۔ وہ بہت دیر تک یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ یہاں کیسے آیا تھا۔ اگر یادداشت میں کچھ تھا تو ایک آواز... ہم ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے۔ کبھی بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ اسے جہنم سے بدتر وہ سولہ دن بھی یاد تھے جو اس نے تھانے میں گزارے تھے اور اپنا نام بھی یاد تھا۔ اسے علم تھا کہ اس نے نورین کو فون کیا تھا اور ایس پی عبدالخالق نے کمالِ مہربانی سے اس کا کیس ختم کرا دیا تھا۔

ایک بوڑھے چہرے کو مقابل پا کر وہ بری طرح چکرا گیا۔ اس کے ساتھ کوئی آنے والا ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اسے ایک انجکشن لگایا اور مسکرا کے بولا۔ ”بہت بہتر ہو تم اب... نام کیا ہے تمہارا؟ بولو... شاباش!“

”کمال احمد... آپ کون ہیں؟“ وہ بوڑھے سے بولا۔

”سوچو... یاد کرو... تم مل چکے ہو مجھ سے... تم میرے آفس میں آئے تھے۔“

”آپ وکیل ہیں؟“ اس پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ ”آپ ہی نے کہا تھا مجھ سے اس کے گھر جا کر صلح کرنے کے لیے... آپ ہی نے کہا تھا کہ اس کالی کلوٹی موٹی بھینس کو مار ڈالو... کیوں کہا تھا...؟“

وکیل نے بڑی مشکل اور کوشش سے خود کو چھڑایا اور بولا۔ ”ہوش میں آؤ کمال! تم نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ تم بے گناہ ہو۔“

ڈاکٹر نے اسے سہارا دے کر وکیل کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا اور بستر پر لٹا دیا۔

”یہ بہت اچھی بات ہے کہ یادداشت لوٹ رہی ہے۔ بہت حوصلہ افزا بات ہے۔ بات کریں ان سے... پرانی باتیں یاد آتے ہی یہ نارمل ہو جائیں گے۔“ ڈاکٹر جاتے جاتے دلاسا دیتا گیا۔

وکیل اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”کمال! یہ میرا گھر ہے۔ میں تمہیں اٹھا کے لایا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ تم سڑک پر میری ہی کار کے سامنے گر کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ اگر میں نے ہوشیاری سے کام نہ لیا ہوتا تو تم کچلے جاتے۔ کوئی اور گاڑی ہوتی تو تم بچ نہ پاتے۔ کیا ہوا تھا آخر تمہیں...؟ بولو...؟“

”میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔“ کمال نے بغیر کسی تذبذب کے کہا۔

اور وہ لمحہ تھا جب خودکشی کا لفظ پہلی بار اس کی زبان سے ادا ہوا تو خودکشی کا خیال اس کے ذہن میں جم گیا۔

وہ ایک ہفتہ وکیل کے گھر میں رہا تھا۔ وہ عام وکیلوں کی طرح خود غرض، مفاد پرست اور کاروباری نہیں تھا۔ اس وکیل نے اس مقدس پیشے کی لاج رکھی ہوئی تھی۔ بڑا نیک دل، مخلص اور بے غرض اور شفیق شخص تھا۔ وہ اس کے گھر میں ایک فرد کی طرح رہا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ بیٹے، بیٹیوں کی شادی کر چکا تھا۔ بیٹے جورو کے غلام بن کر الگ گھر میں رہتے تھے اور اب اس کے ساتھ ایک پرانی ملازمہ تھی۔ کمال وہاں رہ سکتا تھا۔

”جب تک چاہو اسے اپنا گھر سمجھ کے یہاں رہو۔“ وکیل نے کہا تھا۔ ”تمہیں جب کسی چیز اور رقم کی ضرورت ہو مجھ سے بلا تکلف مانگ لینا۔“

وہ ایک ہفتے میں دن رات بہت رویا تھا۔ اس نے وکیل کے سامنے اپنا دل چیر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا دل جو زخمی تھا، اشکوں میں ڈھل گیا تھا۔ وکیل نے اسے بہت تسلی دی تھی اور بہت حوصلہ دیا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا مگر کمال کے یقین میں کمی نہیں آئی تھی کہ ٹھیک کچھ نہیں ہو گا۔ جھوٹ ہے یہ سب... دل کا بہلاوا ہے، خود فریبی ہے۔ وہ اب سہانے خواب دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

وکیل نے اس سے اپنی فیس کی جو پیشگی رقم لی تھی وہ اسے واپس کر دی تھی۔ وہ نہ صرف بڑا وکیل تھا بلکہ اس کا دل بھی فراخ تھا۔ مگر ایک ہفتے کے بعد وہ وکیل کو بتائے بغیر اس گھر سے رخصت ہو گیا۔ کیونکہ وہ مزید اس کا بارِ احسان لینا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ بالکل صحت مند تھا لیکن صرف جسمانی طور پر... اس کے ذہن سے مایوسی اور تاریکی کے جالے دور نہیں ہوئے تھے اور خودکشی کرنے کا خیال اپنی جگہ چٹان کی طرح قائم تھا۔

وہ چورنگی پر کھڑا خلا میں گھور رہا تھا۔ یہ اس کے آشنا راستے تھے مگر وہ آج ان راستوں کے لیے اجنبی ہو گیا تھا۔ آگے دائیں جانب وہ گھر تھا جس میں نورین رہتی تھی۔ وہ ابھی ابھی اس کی نظروں کے سامنے سے سفید کار میں گزری تھی۔ اس نے کمال کو دیکھا بھی تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی ہنسی رکی تھی مگر کار نہیں رکی تھی۔ صرف ایک نگاہ میں نورین کا اس نے جائزہ لے لیا تھا۔ شادی کے بعد مزید حسین اور پُرکشش ہو گئی تھی۔

کمال بے دھیانی میں فٹ پاتھ سے سڑک پر اترا۔ اس کے تصور میں صرف اس وقت نورین تھی۔ ایک کار نے زبردست بریک لگائے مگر اس کے باوجود کمال کو ہلکی سی ٹکر لگی۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا لیکن وہ فوراً ہی کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہو گیا۔

”اندھے ہو یا مرنا چاہتے ہو؟“ کسی نے غرا کے کہا۔

”مرنا چاہتا ہوں۔“ کمال نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”کار کے نیچے آ کر مرنا آسان موت ہوتی ہے۔“

نہ جانے کیوں وہ شخص نیچے اتر آیا تو کمال کو لگا کہ وہ اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دے گا۔ اس نے کمال کو اوپر سے نیچے تک گھور کر دیکھا۔ ”کیا تم واقعی مرنا چاہتے ہو؟ کیا یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہے ہو؟“

کمال نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ”کوئی اعتراض ہے آپ کو...؟ میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”نہیں... اچھا آؤ بیٹھو۔“ غصہ ہونے کی بجائے وہ شخص ہنس پڑا۔ ”ویری گڈ...“

کمال نے غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔ ”مگر کیوں...؟“

”تم مرنا چاہتے ہو نا...؟ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ مجھے کسی بے گناہ کو قتل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ چلو بیٹھو۔“ یہ کہہ کر اس نے کمال کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچ کر گاڑی میں بٹھا لیا۔

اب کمال نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ فرنچ کٹ داڑھی والا، گورا چٹا اور صحت مند نوجوان تھا۔ بڑا چاق و چوبند اور خوش پوشاک!

”کیا المیہ ہوا ہے تمہارے ساتھ... کیا تم نے کسی غریب گھرانے کی حسین لڑکی سے شادی کر لی تھی جو تمہارے کسی مال دار دوست کے ساتھ اس لیے فرار ہو گئی کہ تم اسے وہ نہیں دے سکے جن کے وہ خواب دیکھتی تھی...؟ آج کل لڑکیاں جوان ہوتے ہی بڑے اونچے خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ موبائل، انٹرنیٹ اور کمپیوٹر انہیں انجانے راستوں پر لے جاتے ہیں۔ لڑکی ہو یا شادی شدہ عورت، سبھی خواب دیکھتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہاری بیوی کو کینسر ہو گیا ہو یا پھر بے روزگاری سے تنگ آ گئے ہو۔ کوئی دشمن پیچھے لگا ہوا ہو؟ بے وفا محبوبہ نے رقیب سے شادی رچا لی ہو...؟ بس یہی اسباب ہو سکتے ہیں مگر میرے بھائی! تمہارے مرنے سے کیا ہو گا۔ بیوی واپس آ جائے گی یا محبوبہ...؟ وہ چھوڑ دے گی رقیب کو اور تمہاری قبر پر رو رو کر جان دے دے گی؟ نوکری نہیں ملی تو یار! چوری کرو۔ ڈاکے ڈالو۔ حکومت میں اوپر کیا نہیں ہو رہا ہے...؟ چوری کر رہے ہیں۔ ملکی خزانے پر ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ غبن ہو رہا ہے اور کروڑوں کا قرض معاف کروا رہے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ میں کس کس بات کا رونا روؤں؟ تباہ کر دو اس دنیا کو جس نے تمہیں برباد کر دیا ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو سب کو مار کر مرو تا کہ تمہارے بعد وہ سب خوشی کے شادیانے نہ بجا سکیں جو تمہارے دشمن تھے۔ آج کل اچھے دوست اوّل تو ملتے نہیں اور مل بھی جائیں تو مرنے والے کو کب تک یاد رکھتے ہیں۔ سوئم تک یا زیادہ سے زیادہ چہلم تک... پھر دنیا سب کو بھول جاتی ہے۔ تم بولو کچھ یار! ایسے کیا منہ میں مینڈک دبائے بیٹھے ہو کہ منہ کھولا تو وہ اچھل کے باہر نکل جائے گا۔ یار! رہتے کہاں ہو تم...؟“

”میں تھانے میں تھا۔“ کمال بمشکل بولا۔

”اور اب... کیا گھر جا رہے تھے؟“

”گھر...؟ پتا نہیں گھر ہے یا نہیں...؟ ابھی تو ایک خانہ بدوش ہی ہوں۔“

”اچھا... کام کرو گے؟ رہنے کو گھر بھی ملے گا... پیسہ بھی ملے گا۔ تم اچھے خاصے اسمارٹ آدمی لگتے ہو۔“

اس نے گاڑی کو دائیں جانب ایک کوٹھی کے سامنے روک لیا۔ وہ اس گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ اندر جا کر اس نے کمال کو نشست گاہ میں بٹھا کر کہا۔ ”کامران ہے میرا نام... میرے ساتھ بھی بڑا ظلم ہوا تھا۔ میرا باپ پرانے وقتوں کا اور پرانے خیالات رکھنے والا شریف اور وضع دار آدمی تھا جنہیں آج کل بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ ساری دنیا کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ حق گوئی اور بے باکی نے اسے مروا دیا۔ اپنے پرائے سب اس کے مخالف ہو گئے۔ کسی کے خلاف درخواست کمشنر کو... کمشنر کے خلاف درخواست گورنر کو... کبھی وفاقی محتسب کے پاس، کبھی عدالت عالیہ میں...! فلاں رشوت لیتا ہے۔ فلاں محلے میں غلط دھندا کرواتا ہے۔ فلاں نے یہ دھاندلی کی ہے۔ فائلیں بغل میں دبائے پھرتا تھا۔ دفتر والوں نے بھی زبردستی پنشن پر بھیج دیا تھا۔ کوئی کام تھا نہیں... مگر لوگ کب تک برداشت کرتے۔ ایک ایس ایچ او بڑا جلاد قسم کا آ گیا۔ اس نے پہلے تو خبردار کیا کہ میں باجا بجا دوں گا۔ بڑے میاں نے کھٹ سے آئی جی کو درخواست بھیج دی کہ نیا ایس ایچ او مجھے دھمکاتا ہے۔ ایس ایچ او نے تو کچھ نہیں کیا، سی آئی اے والوں سے کہہ دیا تو وہ زندہ اٹھا کے لے گئے اور چند دنوں بعد مردہ چھوڑ گئے۔ ایک بہن بس سے کالج سے آتی جاتی تھی، بس کنڈیکٹر نے اسے پھنسا لیا۔ پہلے شادی کی پھر اسے دبئی لے گیا۔ آٹھ ماہ بعد اکیلا لوٹ آیا۔ ماں نے پہلے پوچھا پھر اس کے خلاف شکایت کی۔ اس نے الٹا ماں کو مجرم بنا دیا کہ تم نے ہی میری بیوی کو زبردستی گھر میں بٹھا رکھا ہے حالانکہ وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ میں اسے لینے آیا ہوں۔ کیس ہم پر بنا کیونکہ پیسہ اس کے پاس تھا۔ اس کی بیوی برآمد کرنے کے لیے پولیس پارٹی نے ہمارے گھر پر چھاپہ مارا اور میری دوسری بہن کو پکڑ کے لے گئے کہ یہی ہے وہ جسے بڑھیا نے حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ تین دن بعد مدعی بس کنڈیکٹر آیا تو اس نے کہا کہ یہ میری بیوی نہیں ہے۔ اسے چھوڑ دیا گیا مگر تین دن میں کیا ہو گیا۔ یہ کہانی اس قدر شرمناک اور روح فرسا ہے کہ سنانے کے قابل نہیں ہے۔ واپس گھر آ کر میری دوسری بہن نے کپڑوں پر مٹی کا تیل چھڑکا اور خود کو نذرِ آتش کر لیا۔ اس کے مرنے کے بعد ماں پاگل ہو گئی اور پاگل خانے ہی میں مر گئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میری پرورش شاہ جی نے کی۔ وہ ابا کے ساتھی اور دوست تھے مگر ان میں ایک خاص بات تھی۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل سکتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ شرافت پر ناز کرنے کا زمانہ گیا اور اب نام ہوتا ہے بدمعاشی میں... انہوں نے کہا کہ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف جینا سکھایا بلکہ حوادث سے مقابلہ کرنے کی تربیت بھی دی۔ تم دیکھ رہے ہو یہ ٹھاٹ باٹ! یہ سب شاہ جی کا سکھایا ہوا سبق ہے۔ شاہ جی میرے استاد تھے اور باپ کی جگہ تھے۔ دنیا ان کی بڑی عزت کرتی تھی کہ مگر وہ اندر سے کیا تھے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ دنیا میری بھی بہت عزت کرتی ہے۔“ وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

”تم نے جینا کیسے سیکھا؟“ کمال نے دلچسپی اور تجسس سے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میرے جتنے دشمن تھے ان سب کا خانہ خراب ہوا۔ وہ ایس ایچ او جب ڈی ایس پی بن گیا تو اس کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی۔ وہ بچ تو گیا مگر ایک گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی لگی کہ آج تک وہ مفلوج پڑا ہوا ہے۔ تھانے میں تین افراد تھے جن کی وجہ سے میری چھوٹی بہن نے خودکشی کی تھی۔ اب ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہا۔ ان کی لاشیں ایک برس کے وقفے میں مختلف مقامات سے ملیں۔ انہیں قاتل نے مار کر آگ لگادی تھی اور لاشیں جل کر کوئلہ ہوگئی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان کے شناختی کارڈ جوان کی جیب میں تھے محفوظ رہے، اس سے پہچان ممکن ہوئی۔"

کمال نے پھر پوچھا۔ "اور وہ بس کنڈیکٹر...؟ اس کا کیا انجام ہوا؟"

"اس کی ایک بہن تھی جو نہایت حسین تھی۔ اس کی شادی ہوگئی تھی۔ اس کا شوہر ایک شریف آدمی تھا لیکن کنڈیکٹر کی بہن ایک امیر زادے کے دام میں آگئی۔ اس نے اسے بڑے سبز باغ دکھائے۔ شادی کا جھانسا دیا تو اس بے وقوف عورت نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا۔ امیر زادہ اسے جدہ لے گیا۔ جب وہ آٹھ مہینے بعد واپس آیا تو اکیلا تھا۔ اس نے کچھ تصویریں اس کے بھائی کو بھیج دیں اور یہ بھی بتادیا کہ بہن کہاں ہے۔ بھائی سیدھا جدہ گیا اور بہن کو قتل کردیا۔ وہیں اس کی گردن بھی ماردی گئی۔" یہ بتا کر کامران ہنسنے لگا۔ "میرا باپ تو غریب آدمی تھا اور یہ سب میں نے تمہیں اس لیے بتادیا کہ تم خود کو اجنبی محسوس نہ کرو۔ ہم ایک ہی راستے کے مسافر ہیں۔ میں آگے ہوں۔ تم میرے پیچھے آگئے ہو لیکن مجھے بتاؤ کہ تمہیں خودکشی پر مجبور کرنے والا کون تھا؟"

"میں خود..." کمال نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ایک بار نہیں... میں تو کئی بار خودکشی کرچکا تھا۔ میں بے وقوف آدمی تھا۔ بے وقوف ہمیشہ جذباتی ہوتا ہے۔ وہ جان تو دے سکتا ہے۔ جان نہیں لے سکتا۔"

"غلط... یہ تم جیسے جذباتی احمق ہوتے ہیں جن کا استحصال ہوتا ہے جبکہ انہیں جہنم میں دھکیلنے والے نام بھی کما رہے ہیں اور مال بھی...! انہیں یہی دنیا جنت لگتی ہے جس میں ان کے لیے سب کچھ ہے۔ کار، کوٹھی، کیش، کرسی اور کمائی..."

وہ پھر قہقہہ مار کے ہنسا اور بولا۔ "دیکھو۔ اب تمہاری باری ہے۔ میں نے اپنے بارے میں ہر بات سچ بتادی ہے۔"

کامران کی باتوں نے کمال کو بری طرح ہلادیا تھا۔ یہ سب کسی الیکٹرک شاک کی طرح تھا جو ذہنی عدم توازن کے مریض کے دماغ کو بھی درست کردیتا ہے۔ شاید کامران ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے مرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو عین ان کی خواہش کی تکمیل ہوگی جو میرے وجود سے کینسر کے پھوڑے کی طرح نفرت کرتے ہیں۔ مجھے ان سب کو تباہ کردینا چاہیے جنہوں نے مجھ سے میرا حق چھینا، میرا گھر چھینا، میری محبت چھینی...!

کامران نے اس کی درد بھری کہانی سن کر کمال سے سو فیصد اتفاق کیا۔

"لعنت بھیجو نورین پر... یہ محبت خاک تھی کہ اس نے ایک بار بھی تم سے نہیں پوچھا کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ...! اس نے اپنے طور پر ہی اسے سچ مان لیا۔ آخر کیوں...؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں اچھی طرح پہچانا ہی نہیں تھا اس نے ورنہ ساری دنیا کہتی اور وہ نہ مانتی۔ صاف کہتی کہ میرا کمال ایسا نہیں... وہ کسی کو قتل نہیں کرسکتا۔ تم اسے محبت کا نام نہ دو۔ فرض کرو کہ تم سے کوئی آکے کہتا کہ تمہاری نورین نے ایک صنعتکار کے بیٹے سے شادی رچالی جس نے اسے ایک مرسیڈیز گاڑی تحفے میں دے کے اس کا دل جیت لیا ہے؟"

"نورین کے بارے میں ایسی فضول بات کہنے والے کو میں تھپڑ مارتا۔ یقین کرنے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ محبت میں بڑی سچی تھی۔ اس کی محبت میں جو سچائی تھی اس نے میرا دل موہ لیا تھا۔ جیت لیا تھا۔"

"وہ محبت جسے تم سچی سمجھتے رہے ہو وہ ریت کے تودے کی طرح ثابت ہوئی۔ اس نے یقین کرلیا تھا۔ اس کے خیال میں تم ایسے شخص تھے کہ پانچ لاکھ گن پوائنٹ پر لو اور جائداد کے حصول کے لیے ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کو قتل کردو۔ یہ کتنی احمقانہ بات تھی۔ کیا تم واقعی اتنے احمق ہو...؟ جو عقل سے پیدل ہوگا وہ بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ کیونکہ گن پوائنٹ پر لیا ہوا چیک کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا یا تم اسی وقت اپنے چچا کو بھی غسل خانے میں بند کرکے سیدھے بینک جاتے اور کیش وصول کرلیتے۔ چیک تم نے شام کو لیا تھا اور اس وقت کیش نہیں ہوسکتا تھا۔"

"شاید اسے یہ معلوم نہ ہو کہ چیک میں نے کب لیا تھا...؟" کمال نے نورین کا کمزور سا دفاع کیا۔

"چلو معاملہ جو بھی تھا... اسے کم سے کم ایک بار تو تم سے پوچھنا چاہیے تھا کہ کمال کیا یہ سچ ہے؟ اسے تھانے آنے سے کون روک سکتا تھا؟"

"ممکن ہے وہ اپنے باپ کی وجہ سے نہ آئی ہو۔" کمال نے کہا۔

"وہ باہر سے یا گھر سے فون پر بات کرلیتی جیسی کہ اس نے بعد میں کی اور تمہاری وضاحت سنے بغیر ہی فون رکھ دیا۔"

کمال کے ذہن میں نورین کا وہ چہرہ لہرایا جو اس نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ خوبصورت، نکھرا نکھرا، کسی پھول کی طرح تروتازہ، ہنستا مسکراتا ہوا گلابی چہرہ۔ کتنی خوبصورت کار تھی جیسے نئی نویلی دلہن ہو۔ شاید اس کے اے ایس پی شوہر کی ہوگی جو اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے نورین اس کی بیوی نہیں ملکیت ہو۔ لیکن وہ کتنی مطمئن اور خوش تھی۔ جیسے اس نے اپنے خواب کی تعبیر پالی ہو۔ اور اس کے سوا کسی اور کی تمنا نہ کی ہو۔ اس نے کمال کو کیسے دیکھا تھا؟ جیسے وہ چوراہے پر کھڑا کوئی عام آوارہ گرد، پاگل یا فقیر ہو... کوئی ہیرو نیچی...!

کامران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نورین نے اسے بھلادیا تھا۔ گزشتہ ایک برس میں کمال کی ناکامیوں اور بدنامیوں کے بعد اس کے عہد وفا کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی چلی گئی تھیں۔ اس پر قائم ہونے والے مقدمات کے آخری جھٹکے نے اس دیوار کو گرادیا تھا۔ شاید اس نے تسلیم کرلیا کہ اب اس بدنام زمانہ، ناکارہ اور لاوارث شخص کے ساتھ اس کے لیے تمام عمر کا پیمانِ رفاقت ممکن نہیں رہا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کامران نے اس سے اچانک پوچھا۔ "اس وقت تم کہاں رہتے تھے جب تمہیں پولیس نے گرفتار کیا تھا؟"

اتفاق سے وہ اس وقت فلیٹوں کی قطار کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کمال نے ایک بھورے رنگ کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں اس بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں۔"

"تمہارا سامان کہاں گیا؟"

"مجھے نہیں معلوم... کیونکہ میں لوٹ کر گیا ہی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"سامان کیا تھا؟ کچھ تو ہوگا؟"

"ہاں... بینک نے فلیٹ خالی کرالیا تھا اور کار واپس لے لی تھی۔ فرنیچر، ٹی وی اور فریج میرے تھے، میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔"

"اچھا! چلو پتا کرتے ہیں۔" کامران نے کہا۔ "کچھ معلوم ہے مالک مکان کہاں رہتا تھا؟"

"ہاں...! وہ ساتھ والے فلیٹ میں رہتا ہے۔"

کمال کے پاس کوئی چابی نہیں تھی۔ کامران نے کمال کو پیچھے رہنے کا مشورہ دیا اور فلیٹ کے مالک کا دروازہ بجادیا۔

"اس فلیٹ کی چابی ہے تمہارے پاس؟" کامران نے مالک مکان سے بڑے دبنگ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہے... مگر تم کون ہو؟" مالک مکان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اس فلیٹ میں ایک کرائے دار تھا... کمال احمد...؟" کامران نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ تو پکڑا گیا... قتل کے الزام میں...! پولیس سے پتا کرو۔" مالک جواب دے کر تیزی سے اندر جانے لگا۔

کامران نے فوراً ہی اسے روک لیا ورنہ دروازہ بند ہوگیا ہوتا۔

"اتنی جلدی کیا ہے...؟ قتل کے الزام میں تو تم بھی پکڑے جاسکتے ہو۔ الزام عائد کرنے سے کوئی قاتل نہیں بن جاتا۔"

"فلیٹ میں نے کسی اور کو کرائے پر اٹھادیا ہے۔" مالک مکان نے بتایا۔

"اچھا...!" کامران نے کہا۔ "یہ کتنے دن پہلے کی بات ہے؟ کمال احمد کب گرفتار ہوا تھا؟"

"اسے... مہینے سے زیادہ ہوگیا۔" مالک مکان نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"کرائے نامے کی رو سے تم ایک مہینے کا نوٹس دینے کے پابند تھے۔ کیا تم نے نوٹس دیا تھا اسے...؟"

"نوٹس میں کہاں دیتا؟"

"تم مانتے ہو نا کہ نوٹس نہیں دیا تھا...؟ اگر آج کمال واپس آگیا تو معلوم ہے کیا ہوگا؟ تم اندر ہو جاؤ گے چچا! تم نے غیر قانونی طور پر اس کے فلیٹ میں داخل ہوکر اس کا سارا سامان اٹھایا۔ یہ ڈکیتی کہلائے گی۔ تمہارے ساتھ وہ بھی پکڑے جائیں گے جو اس وقت کمال کے فلیٹ میں موجود ہیں۔"

مالک مکان کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "تم نے بتایا نہیں کہ تم کون ہو؟"

"میں وکیل ہوں کمال کا... کمال کے ساتھ ابھی پولیس کو لے کر آتا ہوں۔ ہم دروازہ توڑ کے اندر داخل ہوں گے۔ کمال ابھی تک اس فلیٹ کا کرایہ دار ہے اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ اندر گھس کر کوئی کنڈی لگالے تو دروازہ توڑدے اور پھر جو اندر ہو، اسے اندر کرادے۔"

"میری بات سنیں... چابی ہے میرے پاس... لیکن..." اس کی آواز اٹک گئی۔

کامران نے کمال کو اوپر سے آواز دی۔ "کمال! آجاؤ... اوپر آجاؤ۔"

کمال کو دیکھتے ہی مالک مکان پر جیسے دل کا دورہ پڑ گیا۔ کامران بہت ہوشیار اور چالاک آدمی تھا۔ اس نے مالک مکان کو اعتراف جرم پر مجبور کردیا۔

"دیکھو بھائی!" مالک مکان گڑگڑایا۔ "غلطی ہوئی مجھ سے... مجھے معاف کردینا۔"

"غلطی تو سب کرتے ہیں۔ یہ جرم ہے جو ناقابل ضمانت ہے۔ جانتے ہو اس کی سزا..." کامران نے اسے مزید خوف زدہ کیا۔

"اچھا! جرم کیا میں نے... معافی کی کوئی صورت ہے کیا؟"

"ہاں... کیوں نہیں ہے... ہرجانہ دے دو۔" کامران نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ایڈوانس واپس کرو۔ جتنا سامان اٹھایا ہے، اس کی قیمت ادا کردو بس...! کمال! فہرست ہے سامان کی؟"

"فہرست تو نہیں ہے لیکن مجھے یاد ہے کیا کیا سامان تھا۔ میں اس کی فہرست بنادوں گا۔" کمال نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، ہم کل فہرست لے کر آئیں گے۔ جو تکلیف میرے موکل نے اٹھائی ہے۔ اس کا ہرجانہ کیا ہونا چاہیے۔ تم خود سوچو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بڑی عاجزی سے بولا۔ "دیکھیں جناب! میں غریب آدمی ہوں۔ مجھ پر رحم کریں۔"

"دو فلیٹ ہیں تمہارے اور تم غریب ہو...؟ پتا نہیں شہر میں کتنی جائداد ہوگی؟ کرتے کیا ہو تم؟"

"سرکاری ملازمت!" اس نے بتایا۔

"پھر یہ جائداد کیسے بنالی...؟ خیر! ہم ابھی اس جھگڑے میں نہیں پڑتے۔ کمال یار! ابھی اور اسی وقت فہرست بنادو نا۔ کہیں بھاگ گیا پھر...؟ اس کا بھروسہ نہیں۔ ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔"

مالک مکان انہیں اندر لے گیا۔ طویل مذاکرات، بک بک اور سودے بازی کے بعد پچاس ہزار روپے پر فیصلہ ہوا۔ سات ہزار ایڈوانس، چالیس ہزار سامان کے، دس ہزار ہرجانہ... ستاون کی بجائے پچاس کا چیک مالک مکان نے فوراً پیش کردیا۔ کپڑوں کا ایک سوٹ کیس جس میں کاغذات بھی تھے وہ کمال کو مل گئے۔

”چچا! اگر یہ چیک کل کیش نہ ہوا تو پھر ہم کل پولیس کے ساتھ ہی آئیں گے۔“ کامران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”آپ بے فکر رہیں۔“ مالک مکان نے کہا۔ ”اطمینان رکھیں۔ کل ہر صورت میں کیش ہو جائے گا۔“

باہر آکر گاڑی میں بیٹھتے ہی چیک کمال کے ہاتھ میں دے کر کامران نے کہا۔ ”یہ لو بیٹا! تمہیں پرانے سامان کی نئی قیمت دلوادی ہے۔“

”تم نے تو کمال کر دیا یار!“ کمال نے چیک جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”بھئی دیکھو... یہ تو پہلی قسط ہے۔ ابھی مجرم نمبر دو باقی ہے۔“

”دوسرا مجرم کون ہے؟“

”یار! وہ جو تمہارے فلیٹ میں گھسا بیٹھا ہے۔“ کامران نے کہا۔

رات کو کامران نے اس کے سوٹ کیس سے نکلنے والی تصویروں کا معائنہ کر کے کہا۔ ”یہ ہے ایس پی کی لڑکی... ہے تو بڑی دلکش۔“

”بڑی دغا باز نکلی نورین...! میرا تو خون کھول رہا ہے۔“ کمال نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

”خون مت جلاؤ بیٹے۔ بہت کام آسکتی ہیں یہ تصویریں... آخر وہ ایک اے ایس پی کی بیوی ہے۔ پانچ ہزار روپے ماہانہ دے سکتی ہے یا یکمشت ایک لاکھ۔ تمہاری زندگی آخر اس کی وجہ سے برباد ہوئی۔ تمہارا کرکٹ کیریئر اور مستقبل تباہ ہوا۔ تم آج ٹیسٹ کرکٹ میں ہوتے۔ لاکھوں کماتے۔ اس کی وجہ سے تم اے وی پی نہیں رہے... ایک قاتل بنے اور حوالات میں سولہ دن جوتے کھاتے رہے... آج تمہیں پوچھنے والا کوئی نہیں اور وہ گھوم رہی ہے نئی قیمتی کار میں... اور تمہیں اس نے بھکاری سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔“

رات کمال بستر پر دراز ہوا تو وہ کروٹیں بدلتا رہا جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔ کامران کی باتوں نے اس کے وجود میں انتقام کی آگ بھر دی تھی۔ اس کے تصور میں وہ گھر تھا جس میں نورین رہتی تھی۔ اس گھر کی عالیشان خوابگاہ میں وہ اپنے شوہر کے بازوؤں میں موجود تھی۔ اسے اس کا خیال تک نہ تھا۔ مجھے حوالات بھیج کے خود نکاح پڑھوالیا۔ وہی میری تباہی کی ذمہ دار ہے۔

صبح ناشتے کی میز پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کامران نے کہا۔ ”چلو۔ پہلے چیک کیش کراتے ہیں۔ پھر تمہیں ایک اور تماشا دکھاتے ہیں۔“

کمال نے بڑے دھیان سے اس کی باتیں سنیں اور دوسرا تماشا دیکھنے چلا گیا۔ کامران نے اسے ایک قدرے پھولا ہوا لفافہ دے کر کہا۔ ”یہ پہنچانا ہے تمہیں۔“

”کہاں...؟ کسے دینا ہے؟“ کمال نے لفافہ سنبھال کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”گلشن اقبال میں ایک ہزار گز کا گھر ہے۔ اس میں ایک گنجا کھلاڑی رہتا ہے۔ جب وہ ہاکی کھیلتا تھا تو سوکھا، مریل اور قلاش تھا۔ پھر حسبِ روایت اسے کسٹم والوں نے نوکری دی اور اس نے سابقہ قومی خدمات کے بدلے قوم سے معاوضہ وصول کرنا شروع کر دیا۔“

”یار...! مجھے پھنسا مت دینا۔“

”حد ہوگئی کمال صاحب...! تمہیں تو اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہیے کہ تم میری گاڑی سے ٹکرا گئے اور میں نے تمہیں ساتھ بٹھالیا دوست بنا کے... ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے کہ تمہاری جیب میں پچاس ہزار روپے ہیں... میں نے کیا کوئی حصہ مانگا ہے اس میں سے...؟ تم جاتے تو پھر پکڑے جاتے۔“

کمال شرمندہ ہو گیا اور اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی ابھر آئی۔ ”سوری یار! کیا ہے اس میں...؟“

”بم نہیں ہے۔“ کامران نے جواب دیا۔ ”کچھ تصویریں ہیں اور ایک خط ہے۔ خاتون کو دینا اور لوٹ آنا۔“

کمال نے لفافہ لے لیا اور اطلاعی گھنٹی بجادی۔

ایک ملازم نے اسے نشست گاہ میں لے جا کر بٹھا دیا۔ اس نے خود کو خاتون کا کزن ظاہر کیا تھا۔ خاتون غسل خانے میں نہا رہی تھیں۔ ان کے آنے سے پہلے ان کے انتظار میں غیر ارادی طور پر اس نے لفافہ کھول لیا۔ لفافے میں تصویریں تھیں جو ایک جواں سال حسین عورت کی تھیں اور نامناسب حالت میں تھیں۔ اس نے جلدی جلدی خط پڑھا۔ اس میں ان تصویروں کے نیگیٹوز کے بدلے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ خاتون کے آنے سے پہلے ہی وہ موقع دیکھ کر نشست گاہ سے باہر نکل گیا۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لفافہ اس نے پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔

”کیا ہوا...؟“ کامران نے اس کی حالت دیکھ کے کہا۔ ”مارا اس نے...؟“

”نہیں... اتنی بد اخلاق تو نہیں تھی وہ...“ کمال نے بات بنائی۔

”پھر کیا کہا؟“

”کہہ رہی تھی۔ کامران سے کہنا کہ میں خود بات کروں گی اس سے چند دن میں...“

کامران قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔ ”خواہ مخواہ ڈر رہے تھے تم... اس خوشی میں آج رات ڈنر میری طرف سے۔“

”نہیں... میری طرف سے... تم نے مجھے پچاس ہزار روپے جو دلوائے ہیں۔“

”پچاس ہزار نہیں... ایک لاکھ کہو۔“ کامران نے گاڑی آگے بڑھائی۔ آدھے گھنٹے بعد کمال نے پرانے فلیٹ کا دروازہ بجایا۔

چند لمحوں بعد اٹھارہ انیس برس کے ایک نوجوان نے دروازہ کھولا تو کمال بے دھڑک اندر گھس گیا۔ نوجوان نے چلا کر کہا۔ ”کون ہو تم؟“ دوسرے لمحے اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر کمال کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ کمال نے اسے ایک طرف زور سے دھکا دیا تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور ایک طرف ہو گیا۔

”پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟“ کمال نے سخت لہجے میں پوچھا۔

ایک عورت نے چیخ ماری پھر ایک نسبتاً عمر رسیدہ شخص نمودار ہوا۔ اس وقت تک کامران کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے کمال ایک کرسی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ چکا تھا اور اس کا دیا ہوا ریوالور نکال چکا تھا۔ ریوالور دیکھتے ہی وہ سب لوگ خوف و ہراس سے ساکت ہو گئے تھے۔

”آخر میرے فلیٹ میں کیسے گھسے تم لوگ...؟ میں گولی بھی مار سکتا ہوں تمہیں...“

”یہ فلیٹ... فلیٹ تو ہم نے کرائے پر لیا ہے۔“ نوجوان نے کہا۔

”بکواس بند کرو۔ کرایہ نامہ دکھاؤ مجھے...“ اس نے تڑختے لہجے میں کہا۔

”کرایہ نامہ...! ابھی ملا نہیں۔“ عمر رسیدہ شخص نے آگے آکر کہا۔ ”ہم نے دس ہزار ایڈوانس دیا ہے۔ پندرہ سو روپے ماہانہ کرائے پر فلیٹ لیا ہے۔ یقین نہیں آرہا تو مالک مکان کو بلا کر پوچھ لو۔“

”جہنم میں گیا مالک مکان۔“ کمال نے کہا۔ ”یہ دیکھو میرا کرایہ نامہ اور اس کی آخری رسید۔“

عمر رسیدہ شخص نے فوٹو اسٹیٹ کاپیوں کو غور سے پڑھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا رنگ اڑنے لگا۔

”ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔“ اس عمر رسیدہ شخص نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”میرا سامان کہاں ہے؟“ کمال نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ ”وہ سب کا سب غائب ہے۔“

اب عورت بھی کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے کمال کی بات سن کر کہا۔ ”بیٹا! سامان تو بالکل نہیں تھا۔ فلیٹ بالکل خالی تھا۔“

کمال عورت کی بات سن کر معنی خیز انداز سے مسکرایا اور کہا۔ ”بہت خوب...! آس پاس رہنے والے سب لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ میرے پاس کیا کچھ نہیں تھا۔ ٹی وی، فریج، صوفے، قالین... تم لوگ ڈاکو ہو۔ تالا توڑ کے اندر گھسے ہو اور سارا سامان بھی ہضم کر گئے۔“

ٹھیک وقت پر کامران نے دروازہ بجایا تو کمال نے اونچی آواز سے کہا۔ ”اندر آجائیں وکیل صاحب! میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“

کامران اندر آگیا اور اس نے کمرے کا جائزہ لے کر کہا۔ ”یہ کیا سین ہے بھئی...“

”وکیل صاحب! آپ پولیس کو بلا لائیں۔ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے گھر کرائے پر لیا ہے۔ ان کے پاس کرایہ نامہ نہیں ہے اور میرا سب سامان بھی غائب ہے۔“

بوڑھا شخص ایک دم دل پکڑ کے بیٹھ گیا۔ ”سنو بیٹا!“

”بیٹا نہیں ہوں میں تمہارا... میرے باپ ہوتے تو اس گھر کا تالا توڑ کے بھی اندر آسکتے تھے؟ تم سب بدمعاش اور ڈاکو ہو... تمہارا گروہ ہے پورا... عورتیں بھی شامل ہیں اس میں... تالا توڑ کے گھس جاتے ہو جہاں موقع ملے۔“

بہت رو پیٹنے کے بعد بڑے میاں نے کانپتے ہاتھوں سے پچاس ہزار کا چیک کاٹا اور کمال کو پیش کیا۔

”ہماری غلطی اور بے وقوفی کو معاف کر دو بیٹا! ہم شریف لوگ ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہمیں پھنسا دیا گیا ہے۔“ انہوں نے بڑی ندامت سے کہا۔

”ٹھیک ہے چچا!“ کمال نے چیک کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس چیک میں کوئی فراڈ تو نہیں ہے نا...؟ جانتے ہو بوگس چیک دینا انتہائی سنگین جرم ہے؟“

”اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو پھر ایسا کرنا کہ دو گھنٹے کے بعد میری دکان پر آجانا۔ میں نقد رقم دے دوں گا۔“

”میں جانتا ہوں کہ غلطی تمہاری نہیں ہے۔“ کمال نے کہا۔ ”تم چاہو تو مالک مکان سے اپنا نقصان پورا کر لینا۔ اگر تم میں ہمت ہے تو مع سود وصول ہو جائے گا۔“

آدھے گھنٹے بعد بینک سے چیک کیش ہو گیا تو اب کمال کے پاس ایک لاکھ کی رقم ہو چکی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔

کامران نے جو اندھیرے میں تیر چلایا تھا وہ ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ اس کے فلیٹ کا کرایہ دار ہتھیار ڈال دے گا۔ اس کی کوئی ایسی کمزوری تھی کہ اس نے پچاس ہزار کی رقم کا چیک دے دیا تھا اور وہ کیش بھی ہو گیا تھا۔ کمال کو آم کھانے سے مطلب تھا۔ پیڑ گن کر کیا کرنا تھا؟

تصویروں کا لفافہ ابھی تک اس کی جیب میں تھا اور وہ خود کو کامران کے سامنے مجرم محسوس کرنے لگا تھا۔ کیونکہ اس نے ایک طرح سے اپنے محسن کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ جس شخص نے اسے جینے کی نئی راہ دکھائی اور کامیابی حاصل کرنے کا گر سکھایا اس نے اس کے اعتماد کو مجروح کیا تھا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک دلائل کی کشمکش جاری تھی۔ اس کے وجود میں جو نیکی تھی وہ کہتی تھی کہ کسی عورت کو بلیک میل کرنا بدترین

اخلاقی جرم ہے۔ان تصویروں کو صرف ایک نگاہ دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ تصویریں نشہ آور انجکشن دے کر اتاری گئی ہیں۔یہ ایسی تصویریں تھیں کہ کوئی بھی شریف عورت ان تصویروں کے نیگیٹوز ہر قیمت پر حاصل کر لیتی۔ اس کے نزدیک کسی مجرم کے عزائم پورے کرنے میں معاونت کرنا جرم ہے لیکن اس کے مجرمانہ منصوبے کو کامیاب نہ ہونے دینا کوئی جرم نہیں۔

رات کو ہوٹل کے خواب ناک ماحول میں کامران نے اس کا تعارف ایک لڑکی سے کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ مس شیریں ہیں۔بہت جلد ڈاکٹر بن جائیں گی۔یہ فی الحال میرے بیمار دل کا علاج کر رہی ہیں اور غالباً خود بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔“

شیریں شرما کر اور شیریں ہو گئی تو اور حسین دکھائی دینے لگی۔وہ پیار بھری خفگی سے بولی۔ ”شٹ اَپ۔“

”یہ خاتون بھی دوسروں کی طرح ڈاکٹر بن کے دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہیں۔اگر تم دکھی انسان ہو تو یہ تمہاری خدمت دل وجان سے کر سکتی ہیں۔“ کامران نے مسکرا کر کہا۔

”میں تو واقعی بہت دکھی انسان ہوں۔“ کمال نے رونی صورت بنا کے کہا۔

دوسری لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی تو اس کی ہنسی سر کی طرح فضا میں گونجی تھی۔شیریں کے ساتھ جو دوسری لڑکی تھی اور جس کا نام مہ تارا تھا کمال اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔یہی کامران چاہتا تھا۔شیریں کے مقابلے میں وہ بہت شوخ، طرح دار اور تیز وطرار تھی۔

وہ دونوں ہاسٹل میں رہتی تھیں اور انہیں کہیں جلدی جانا تھا۔ڈنر کے بعد وہ رخصت ہونے لگیں تو اگلے دن کا پروگرام طے ہو گیا تھا۔انہوں نے واجبی سا احتجاج کیا تھا۔کچھ شرمانے کی اداکاری کی تھی اور بہانے کیے تھے جو سب دکھاوا تھے۔کامران اس کھیل کا ماہر تھا۔اس نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

”میں ریسٹ ہاؤس بک کرا لوں گا۔کل چودھویں کی رات ہے۔ہم جھیل میں کشتی رانی کریں گے۔صبح مچھلی پکڑیں گے اور فرائی کریں گے۔تازہ مچھلی کی بات ہی اور ہوتی ہے...زبردست پکنک ہو گی۔“

شیریں نے مہ تارہ کی طرف، مہ تارہ نے شیریں کی طرف دیکھ کے نگاہوں کی زبان میں بات کی اور بالآخر اعتراف کر لیا تھا کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ان کے جانے کے بعد کامران نے کافی منگوالی۔ ”یہ دونوں تگڑی آسامی ہیں۔ایک کا باپ بہت بڑا زمیندار ہے اور دوسری کا امپورٹر یعنی اسمگلر...دونوں ایک ایک لاکھ فوراً دے دیں گی۔“

”وہ کس طرح؟“

کامران نے مسکرا کر کہا۔ ”دونوں کے پاس قیمتی گاڑیاں ہیں۔کیوں نہ ان سے ٹرانسفر لیٹر لے لیں کہ گاڑی ہمیں بیچ دی ہے۔ان کے امیر کبیر ابا دوسری دلوا دیں گے۔کون سی ان کے پاس حلال کی کمائی ہے۔“

”وہ پوچھیں گے نہیں کہ...؟“ کمال نے سوال اٹھانا چاہا۔

”انہیں ابا سے کہنا پڑے گا کہ گاڑیاں چوری ہو گئیں اور ہم نے رپورٹ بھی لکھوا دی۔کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں ہو گی۔ہم تو رسید دکھا دیں گے اور ٹرانسفر لیٹر کہ خواتین نے ہمیں گاڑی فروخت کی ہے۔“

کمال ہنس پڑا۔ ”یار! تم نہ صرف استادِ اعظم ہو بلکہ خبیث بھی ہو۔“

”تھینک یو... تھینک یو...“ وہ کورنش بجا لایا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم بھی مہا خبیث بن جاؤ۔تم ہینڈسم اور اسمارٹ ہو۔باتیں اچھی کر لیتے ہو۔یہ لڑکیاں لچھے دار باتوں کے جال میں مکڑی کی طرح پھنس جاتی ہیں لہٰذا عیش کرو اور کیش بھی الگ وصول کرو۔“

☆...☆...☆

کمال اپنی کمائی بینک میں رکھوانے گیا تھا۔لنچ پر ان کی ملاقات ایک چینی ریستوران میں طے تھی۔کمال وہاں پہنچا تو میز پر دو نئی لڑکیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”یہ شمی ہیں... پورا نام ہے شمیم آراء... سوشل ورکر ہیں۔صحافی ہیں۔شاعرہ ہیں اور قاتل ہیں۔“ کامران نے کہا۔

”ڈاکے بھی ڈالتی ہیں۔“

”کیا بک رہے ہو...؟“ شمی ہنسی۔

”بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ...کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔“ کامران نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”ڈاکا آپ نے میرے دل پر ڈالا ہے اور چرا لیا ہے... قتل آپ نے مجھے کیا۔“

شمی نے بھی اٹھلا کے کہا۔ ”شٹ اَپ۔“

کامران بولا۔ ”یہ دوست ہیں ان کی۔ظاہر ہے ان کی صفات بھی یہی ہوں گی ورنہ دوستی کیسے ہوتی؟ شمی ڈارلنگ! یہ میرا پارٹنر ہے کمال!“

”آپ کا ذکر اکثر ہوتا تھا۔“ شمی نے کہا۔ ”بہت تعریف کرتا تھا کامران آپ کی۔“

کمال بھونچکا رہ گیا۔کامران نے اسے آنکھ ماری اور اس کی سہیلی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اور شمی ان کی تعریف کرتی تھی۔دیدار آج ہوا۔مس شمی! برا مت مانیے گا اگر میں پٹڑی بدل لوں۔اپنے حق میں اچھا نہیں کیا تم نے مجھے ان سے ملوا کے۔“

شمی ہنسنے لگی۔ ”گل کو بتا دیا تھا میں نے کہ تم خطرناک آدمی ہو۔“

اب کمال بولا۔ ”صرف گل...؟ گل داؤدی، گل یاسمین، گل دان، گلبرگ!“

گل مسکرائی۔ ”گلنار ہے جی میرا پورا نام...“

ان کے جانے کے بعد کامران نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم نرے گدھے ہو۔“

”بالکل ٹھیک...مجھے انکار نہیں... تم کیا خبر لائے ہو؟“ کمال نے پوچھا۔

”وہ تو زندہ ہے... تمہاری منگیتر۔“

کمال اچھل پڑا جیسے بجلی کے کھلے تار نے چھو لیا ہو۔وہ بولا۔ ”یقیناً تم نے اس کا بھوت دیکھا ہو گا۔“

”بے وقوف آدمی...اس کا قتل ہوا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی رپورٹ ہے کسی تھانے میں... تم بلاوجہ جوتے کھاتے رہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ کمال پریشان ہو کر بولا۔

”ہو سکتا ہے بیٹے...! اس دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ کامران نے کہا۔ ”تصدیق کرنا چاہتے ہو تو تھانے چلے جاؤ۔وہ تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔نورین کے باپ نے کہا تھا کہ اس لونڈے کے دماغ سے عشق کا بھوت اتارنا ہے۔اس سے دہرا فائدہ حاصل ہوا۔نورین تم سے بدظن ہو گئی۔تم ایک گھٹیا آدمی ثابت ہوئے۔اس کی توقع سے زیادہ ذلیل۔اس کی نفرت کا ردعمل فطری بات تھی۔“

”کیا اسے نہیں معلوم کہ میں بے گناہ تھا؟“ کمال نے تکرار کی۔

کامران نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اسے وہی معلوم تھا جو اسے بتایا گیا۔اس کے باپ نے کہا کہ تھانے فون کر کے پوچھ لو۔جس دن ریمانڈ کا ڈرامہ رچایا گیا تھا وہ عدالت میں موجود تھی۔اس نے دیکھا تھا تمہیں ہتھکڑی سمیت مجسٹریٹ کے سامنے مجرموں کے کٹہرے میں۔“

کمال کے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔یہ نفرت کی بادِ سموم ہی تھی جس نے نورین کی محبت کے گلشن کو جلا کے خس وخاشاک کا ڈھیر کر دیا تھا۔قصوروار نورین نہیں تھی اس کا باپ تھا۔قصوروار ہمیشہ کوئی اور ہوتا ہے لیکن سزا کسی اور کو ملتی ہے۔اس جھوٹ کی آگ کمال کو جلائے دے رہی تھی۔سازش نورین کے مکار باپ نے کی تھی۔وہ جانتا ہو گا۔اس نے اپنی بیٹی کے تیور اور محبت کے جذبے کی سرکشی سے جان لیا ہو گا کہ وہ نورین کو روک نہیں سکے گا۔اگر اس کی بیٹی نے ضد، ہٹ دھرمی اور سرکشی سے کمال سے شادی کر لی تو رسوائی اور بدنامی کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔بیٹی یا بہن کے معاملے میں ہر شخص مجبور ہوتا ہے۔ایس پی جہاں دیدہ اور شاطر آدمی تھا۔اس نے کمال سے کرکٹ چھڑوا دی۔نوکری چھڑوا دی۔گھر چھڑوا دیا۔وہ اکیلا اور لاوارث ہو کر رہ گیا۔ایس پی نے ہر جگہ اس کے لیے ملازمت کے دروازے بند کر دیے۔اس کی واپسی کو ناممکن بنا دیا۔اس کے خلاف بیانات شائع کرائے اور اسے کرکٹ کی دنیا سے جلاوطن کرا دیا اور اس کے جذبات سے کھیلتا رہا اور آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز سے دھکیلتا رہا۔منافقانہ شفقت کے ساتھ... تم یہ کر سکتے ہو؟ تم وہ کر سکتے ہو؟ کچھ تو کر کے دکھاؤ۔وہ جانتا تھا کہ کمال کچھ نہیں کر سکتا۔جہاں بھی جائے گا راستے پہلے سے بند پائے گا۔نتیجہ یہ ہوا کہ کمال بازی ہار گیا۔

کمال ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔اس نے مشتعل ہو کر کہا۔ ”میں اس مردود اور ملعون کو قتل کر دوں گا۔“

”ویری گڈ...“ کامران مسکرا کے بولا۔ ”میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ہم مل کے اسے قتل کریں گے۔ابھی بیٹھو یار! ابھی تم جذباتی اور مشتعل ہو رہے ہو...ابھی تمہارا سر گرم ہو رہا ہے۔اس پر عقل کی برف ڈالو پہلے...“

کمال دھپ سے بیٹھ گیا۔ ”کامران...میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔“

”کسے...نورین کو...؟ بالکل ٹھیک“

”نورین...نورین کا کیا قصور ہے اس میں؟“ کمال نے برہمی سے کہا۔ ”دھوکا تو اسے بھی دیا گیا۔اسے کہاں معلوم تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔“

”یار...! تم سمجھتے کیوں نہیں۔اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش تک نہیں کی۔وہ ایک بار مل لیتی تم سے یا فون ہی کر لیتی تو معاملہ صاف ہو جاتا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ کمال بولا۔ ”مگر باپ نے تو اسے ریمانڈ ڈرامہ بھی دکھایا تھا۔کیا وہ مجسٹریٹ جعلی تھا؟“

”مقدمہ کہاں درج ہوا تھا میرے یار! قتل کے کیس کا تو تمہارے چچا کو بھی علم نہیں ہو گا۔بے شک پوچھ لو جا کے ان سے...وکیل نے تمہاری حالت پر ترس کھا کے تمہیں کچھ پیسے دے دیے۔ایس پی سے اسے فیس ملی ہو گی۔وہ تمہیں چچا کے گھر نہ بھیجتا تو تم پر قتل کا کیس بھی نہ بنتا۔“

”وکیل کو کیا معلوم یار کہ ایس پی نے کیا شیطانی منصوبہ بنا رکھا ہے؟“ کمال نے کہا۔ ”اسے علم ہوتا تو وہ مجھے ادھر نہ جانے دیتا۔“

”خیر چھوڑو یہ بات...اب ایک تمہیں نمٹنا ہے نورین اور اس کے باپ سے...اس کے بعد اپنے چچا حکیم جی سے... نورین اور اس کے باپ کو تم بڑی آسانی سے بلیک میل کر سکتے ہو ان تصویروں سے جو تمہارے پاس ہیں۔“

”تصویریں...؟“ کمال نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

”ہاں... پانچ لاکھ کا جوتا مارنا چاہتے ہو نا تم... اس سے پانچ لاکھ لے لو۔“

”وہ نہیں مانے گا۔“

”مانے گا کیسے نہیں۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو پچاس لاکھ مانگتا اور پچیس لاکھ لازمی وصول کر لیتا۔ مال حرام سے خزانے بھرے ہوئے ہیں اس کے... جتنا لوٹ سکتے ہو لوٹ لو۔ دشمن کے ساتھ رعایت کیسی...؟ اسے تباہ کر دو جیسے اس نے تمہیں تباہ کیا تھا۔ وہ تصویریں جعلی نہیں ہیں۔ ایک ٹرمپ کارڈ ہے تمہارے پاس...“

کمال نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”پہلے میں چچا سے تو مل آؤں...؟“

”ضرور ملو... میں منع نہیں کرتا لیکن یاد رکھو کہ وہ بھی تمہارا دشمن ہے اور اس کے خلاف ٹرمپ کارڈ ہے لالہ رخ... پہلے نورین والی بازی کھیلو۔“

”میں... میں سب سے بدلہ لوں گا۔ گن گن کر انتقام لوں گا۔“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

کامران نے بدمزگی سے کہا۔ ”یار! یہ لفظ استعمال مت کیا کرو۔ یہ کہو کہ میں انصاف کروں گا اور اپنا حق لوں گا۔“

وہ خاموشی سے اٹھا اور کامران کو تعجب خیز حالت میں چھوڑ کے باہر نکل گیا۔ سڑک سے خالی گزرنے والی ٹیکسی ایک اشارے پر رک گئی۔ وہ بے خیالی میں دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”کہاں جانا ہے سر...!“ ٹیکسی والے نے اسے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ خیالوں کے گرداب سے نکل آیا۔ چونک کر بولا۔ ”مجھے جانا ہے شفاخانہ نجابت...“

ٹیکسی والے نے اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ ”یہ کہاں ہے؟ میں یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔“

کمال نے اسے پتا سمجھا دیا۔ اس کے ذہن میں چلنے والی بادِ سموم تھم گئی تھی۔ اب محض سناٹا تھا اور خاموشی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ کہیں سے گھٹا اٹھی ہے۔ اچانک فضا میں نمی اور خنکی آگئی ہے۔ پیاسی زمین کے سینے سے اٹھنے والی خوشبو نہ جانے کدھر سے آرہی تھی۔

وہ ٹیکسی سے اتر کر شفاخانے کی طرف بڑھا۔ اسے چچا نجابت علی کے معمول کا علم تھا۔ وہ دوپہر دو بجے سے چار بجے تک شفاخانہ بند کر دیتے تھے۔ یہ ان کا قیلولہ کا وقت ہوتا تھا۔ چچا سو کے ہی اٹھے ہوں گے۔ اب وہ منہ دھوئیں گے۔ پھر ایک کپ چائے پئیں گے۔ سبز چائے الائچی والی۔ عین دروازے پر اس کے قدم رک گئے۔ بند دروازے پر ایک کاغذ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

بوجہ انتقال پُرملال نجابت علی خان شفاخانہ تین یوم کے لیے بند رہے گا۔

وہ دیر تک اس مضمون کو یوں دیکھتا رہا جیسے اس عبارت کا اصل مفہوم کچھ اور ہے جسے وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر ایک رکشا اس کے قریب آکر رکا اور کسی نے کہا۔ ”ابے لے... حکیم صاحب بھی گزر گئے۔“ وہ چونکا اور اس نے رکشا سے اترنے والے کی طرف دیکھا مگر وہ پھر رکشا میں بیٹھ چکا تھا۔ اس کی برقع پوش بیوی ہی غالباً حکیم صاحب کی مریض تھی۔

آہستہ آہستہ کمال بوجھل قدموں سے فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ حکیم نجابت علی خان کا سوئم جمعرات کو ہو چکا تھا۔ پھر جمعہ گزر گیا تھا اور ہفتہ بھی گزر گیا تھا۔ آج اتوار تھا مگر تین دن کے لیے سوگ میں بند کیا جانے والا مطب ہنوز بند تھا۔

اس کی دستک پر دروازہ خود لالہ رخ نے کھولا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ گنگ ہو گیا۔ وہ کمال کو جن نظروں سے دیکھ رہی تھی، ان کی تاب لانا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

اندر سے اس کی ماں نے چلا کر پوچھا۔ ”کون ہے لالہ رخ...؟“

لالہ رخ نے کہا۔ ”آئیے... باہر کیوں کھڑے ہیں؟“

وہ سر جھکائے کسی مجرم کی طرح اندر چلا گیا اور لالہ رخ نے دروازہ بند کر دیا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا کہ یہ وہی کالی، موٹی اور بدصورت سی بھینس ہے...؟ کہیں وہ لالہ رخ کی بجائے کسی اور لڑکی کو تو نہیں دیکھ رہا...؟ لوہے کی بالٹی پر جیسے قلعی کر دی گئی تھی۔ لالہ رخ پہلے کے مقابلے میں اپنا وزن بہت کم کر چکی تھی۔ اب وہ سلم ہی نہیں بلکہ انتہائی دلکش اور پُرکشش ہو گئی تھی۔ اس کا سیاہی مائل رنگ نکھر آیا تھا۔ اس کی صورت بڑی موہنی ہو گئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور چہرے کے تیکھے تیکھے نقوش اس کی آنکھوں میں جذب ہوتے ہوئے من کے نہاں خانے میں نقش ہوتے گئے۔

اس کے سامنے صرف نورین ہی کا نہیں بلکہ ان لڑکیوں کا سراپا بھی ماند پڑتا گیا جو کبھی اس کے پرستاروں میں تھیں۔ اس نے اس کے چہرے پر ایسی نرمی اور دلکشی پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔ اس کے حزن و ملال میں اداسی کا وہی حسن تھا جو دیکھنے والوں کو چودھویں کے طلوع ہونے والے چاند کی روشنی میں نظر آتا ہے۔

ماں نے پھر چلا کے پوچھا۔ ”اری بولتی کیوں نہیں...؟“

”امی...! کمال آئے ہیں۔“ اس نے اندر جا کر دبی آواز میں کہا۔

”اور تو نے اسے اندر آنے دیا...؟ اس کمینے کو وہیں سے دھتکار دینا تھا۔ اب کیا لینے آیا ہے ہمارے پاس...؟“ اس کی ماں ہذیانی انداز میں چیخی۔

”امی...!“ لالہ رخ نے ماں کو ڈانٹا۔ ”یہ خاندانی لوگوں کا وتیرہ نہیں ہے۔ کیا اس طرح بات کی جاتی ہے اپنوں سے؟ وہ تعزیت کے لیے آئے ہوں گے۔“

”نہیں ہے وہ ہمارا... کہہ دے اسے۔“

”وہ تایا شرافت علی خان کے بیٹے ہیں... آپ کے بھتیجے ہیں۔ آپ کے سوا کون ہے ان کا؟“ وہ آہستہ آہستہ ماں کو سمجھا رہی تھی۔ کوشش کر رہی تھی کہ آواز کمال تک نہ پہنچے۔ ”ابا جان نے مرتے وقت کیا کہا تھا؟“

”اچھا! تو چل میں آتی ہوں۔“ چچی کی آواز آئی۔

لالہ رخ پھر سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتی آئی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”بہت دن بعد آئے ہیں آپ! کہیں چلے گئے تھے...؟“

”میں... ہاں!“ آواز کمال کے گلے میں پھنس گئی۔ ”کیا ہوا تھا چچا جان کو...“

”بس ویسے ہی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ دل کے مریض تو تھے ہی... دواخانے سے گھر آئے تھے۔ رات بڑی مشکل سے گزاری۔ صبح کی اذان کے ساتھ...“ وہ رونے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر۔

”حوصلہ رکھو لالہ...!“ کمال نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ ہٹا کر اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ کمال اپنی جگہ آبیٹھا۔ اسے عجیب سی بے چینی اور وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”چچا جان نے رحلت کے وقت کیا کہا تھا لالہ...؟“

لالہ رخ نے آنسو دوپٹے سے صاف کیے۔ لمبے، گھنے اور سیاہ ریشمیں بالوں کو ایک ادا سے پیچھے کیا اور بولی۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ کمال کو اس کا حق دے دینا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ آخری وقت کی توبہ قبول تو نہیں ہوتی۔ بس میں دنیا کے بہکاوے میں آگیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بڑی کمینگی کا سلوک کیا تھا۔ وہ تو بچہ تھا اپنا... بھائی جان شرافت علی خان نے اسے میرے حوالے کیا تھا۔“

”تمہیں... مجھ سے کوئی گلہ تو نہیں لالہ...!“

اس نے سر جھکا لیا۔ ”تقدیر سے گلہ کرنے سے کیا ہوتا ہے کمال؟ آدمی اپنا نصیب تو نہیں بدل سکتا۔ یہ بتائیں آپ کا چیک کیش ہو گیا تھا؟“

کمال چونکا۔ ”کون سا چیک...؟“

”جو ابا جان نے دیا تھا... پانچ لاکھ کا...!“

کمال کا چہرہ یوں لال ہو گیا جیسے لالہ رخ نے اس کے گال پر تھپڑ مار دیا ہو۔ ”وہ چیک انہوں نے کینسل نہیں کر دیا تھا؟“

”نہیں...!“ لالہ رخ بولی۔

”مگر... انہوں نے تو مجھ سے کہا تھا۔“

”ہاں... بعد میں وہ شرمندہ ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بیٹا لالہ رخ... اگر کوئی مجھ سے کچھ مانگنے آئے سوالی بن کے اور میں اسے کچھ دے دوں تو کیا مجھے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہیے؟ میں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں... لیکن بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا کمال آیا تھا۔ اس کا ہاتھ بہت تنگ ہے آج کل... پریشان پھرتا ہے۔ میں نے اسے پانچ لاکھ کا چیک تو دے دیا مگر ساتھ ہی شرط رکھ دی کہ صبح تک یہ چیک کینسل ہو جائے گا۔ میں نے کہا۔ ابا جان! آپ لوگوں کو غلط مشورے دیتے ہیں اور ان کی مانتے بھی جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج آپ کے پاس اپنے بھی نہیں رہے۔ تایا جان سے کیے ہوئے وعدے کا بھی پاس نہیں رہا آپ کے دل میں... بس اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ صبح خود انہوں نے بینک فون کیا تھا منیجر کو کہ کہیں آپ کو پریشانی نہ ہو کیونکہ اتنی بڑی رقم کا چیک آسانی سے کیش نہیں ہوتا۔“

”میں... میں نے وہ چیک پھاڑ دیا تھا لالہ...!“

لالہ رخ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ دوپٹے میں اپنی ایک انگلی لپیٹتی اور کھولتی رہی۔

چچی اندر آئی تو کمال کھڑا ہو گیا۔ چچی نے اس سے گلے مل کے رونا شروع کیا تو ضبط کی کوشش کے باوجود کمال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”اب آیا ہے بدبخت...! اتنا زلانے کے بعد... تیرے چچا کو آخری وقت تک آس رہی کہ تو آئے گا۔ تو وعدہ کر کے گیا تھا ان سے... وہ کہتے تھے کہ کمال جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا۔ آخر بھتیجا ہے میرا...“

”امی...!“ لالہ رخ نے تنبیہ کی۔

”اچھا بیٹھ... کیا فائدہ پرانی باتوں کے دہرانے کا۔“

”میں کہیں چلا گیا تھا چچی! اس لیے نہیں آسکا تھا۔“

”ابا جان کے دعوے کا آپ پر کوئی قرض نہیں ہے۔ آپ آزاد ہیں مسٹر کمال!“ لالہ رخ نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔

چچی نے پھر رونا شروع کیا۔ ”انہوں نے کہا تھا کمال کو سب دے دینا جو اس کا ہے۔ میں بڑے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا اس جہاں میں جا کے... وہ پوچھیں گے کہ میں نے کمال کو تو تمہارے سپرد کیا تھا۔ یہ تم نے کیا غیروں والا سلوک کیا اس کے ساتھ نجابت علی...“

”پرانی باتوں کو بھول جائیں چچی...!“کمال نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

”کل میں وکیل سے کہہ دوں گی کہ مقدمہ واپس لے لیں۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ہمارے رہنے کو یہ جگہ بہت ہے۔ حویلی لے کر ہم کیا کریں گے اور شفاخانہ اب کون چلائے گا؟“

”میں چلاؤں گا چچی!“کمال نے بے اختیار کہا۔

”تم... کاش! تم نے حکمت سیکھی ہوتی۔“ چچی نے آہ بھری۔ ”اب تو وہ نسخے تمہارے والد اور چچا کے ساتھ دفن ہوگئے۔“

”میں اسپتال بناؤں گا چچی...! ان کے نام پر۔“

”تم کوئی ڈاکٹر ہو کہ اسپتال چلاؤ گے؟“ چچی نے طنز کیا۔

”میں ڈاکٹر رکھوں گا... خود انتظام چلاؤں گا۔ حویلی بک جائے گی۔ اس کی رقم سے پرانے شفاخانے کی جگہ نئی عمارت بن جائے گی۔ عمارت ہو تو ڈاکٹر خود آجاتے ہیں۔ کمروں کے باہر ان کے نام کی تختی لگ جاتی ہے تو مریض بھی پہنچ جاتے ہیں۔ ہم تو مالک ہوں گے چچی!“

”نا بیٹا...! میں کہو... ہم نہیں...“

”میرا مطلب تھا... میں اور لالہ رخ... میں بہت بدبخت اور نافرمان ہوں۔ بہت دکھ دیے ہیں میں نے آپ کو... ابا جان اور مرحوم چچا کو مگر بچے نادان ہوتے ہیں۔ غلطیاں کرتے ہیں اور بڑے تو بڑے ہی ہوتے ہیں۔ بڑا ظرف رکھتے ہیں۔ انکار مت کیجیے گا۔“

”ارے باؤلا ہوا ہے لڑکے... زبان دے کے میں انکار کر سکتی ہوں۔ بھلا کبھی ایسا بھی ہوا ہے خاندانی لوگوں میں... تو نہ آتا، وہ ساری عمر بیٹھی رہتی۔ ٹھیکرے کی منگنی بھلا توڑی جاسکتی ہے؟“

لالہ رخ چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی۔ ”اماں! آپ وہ فائل تو لے آئیں۔ حویلی اور شفاخانے کی۔“

لالہ رخ نے عمداً اماں کو باہر بھیجا تھا ورنہ وہ فائل خود بھی لا سکتی تھی۔

”کمال صاحب...! امی کی باتوں کو چھوڑیے۔ یہ پرانے وقتوں کے لوگ تھے۔ چچا بھی تایا بھی... مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔“

”تم سے پوچھا کس نے ہے ابھی؟“

”میں آپ کو بتا رہی ہوں پہلے سے...“

”جو پہلے سے طے ہے، وہ طے ہے... کہتے ہیں کہ دیر آید درست آید...! تم سمجھ لو کہ میں صبح کا بھولا ہوں جو شام کو لوٹ آیا ہے۔“

اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ ”میں انکار کردوں گی۔“

”کردینا... میں اٹھا کے لے جاؤں گا۔ اپنی چیز کوئی زبردستی لے جائے تو مجرم نہیں ہوتا۔“کمال نے کھڑے ہو کر اسے بازوؤں میں بھر لیا اور بولا۔ ”میں اب چلتا ہوں۔“

”ارے کہاں چلا...؟“ چچی فائلیں اٹھائے اندر آئیں۔ ”یہ فائلیں لے جا اور کھانا کھائے بغیر جائے گا کیا؟“

’فائلیں اپنے پاس رکھیں چچی! یہاں ہیں سمجھو میرے پاس ہی ہیں... لالہ رخ کی طرح...“ اس نے کہا اور آداب کرکے باہر نکل گیا۔

اس نے وہ مسکراہٹ دیکھی ہی نہیں جس نے لالہ رخ کے ماضی سے اس کے مستقبل تک پھیلے ہوئے اندھیرے کو روشن کردیا تھا۔

کمال باہر سڑک پر آیا تو دنیا بہت بدل چکی تھی۔ سارے ٹرمپ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھے مگر وہ بازی ہار چکا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ بازی ہار کے بھی کبھی اتنا خوش اور مطمئن نہیں ہوا تھا۔

اس نے وہ لفافہ جیب سے نکالا جس میں پانچ لاکھ کے مطالبے کے ساتھ چند تصویریں تھیں۔ اس نے ایک ایک تصویر کے پرزے کرکے کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیے۔ وہ گھر پہنچا تو کامران موجود نہیں تھا۔ اس نے اپنے سوٹ کیس میں سے نورین کی تصویریں اور کچھ خط نکالے اور انہیں کچن میں نذرِ آتش کردیا۔ پھر اس نے سوٹ کیس باہر لے جاکر رکھا اور کامران کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

کامران کسی طوفان کی طرح گاڑی دوڑاتا ہوا پورچ میں داخل ہوا اور اس نے وہیں سے چلانا شروع کردیا۔ ”کمال!“ کمال نے باہر آکر پوچھا۔ ”کیا ہوا یار...؟“

”ہونا کیا ہے۔ دیر ہوگئی... یاد نہیں، شیریں اور مہ تارہ کو وقت دیا تھا ہم نے... ہمیں ان کے ساتھ جھیل پر جانا تھا۔“

”میں تیار ہوں۔“

”بس میں ذرا کیمرا لے لوں۔“ کامران کو اچانک یاد آگیا۔ ”شیریں اور تمہاری مہ تارہ کی بھی یادگار تصویریں... یہ سمجھو کہ لاٹری نکل آئی۔ ہر مہینے لاکھوں کہیں نہیں گئے۔ یہی تصویریں ٹرمپ کارڈ بن جائیں گی۔ یہ کام آئیں گی۔“

کمال نے چابی نکال کے ڈکی کھولی اور اپنا سوٹ کیس اس میں رکھ دیا۔ کامران چند منٹ بعد کیمرا لیے آگیا۔ اس نے کیمرا کمال کو دے دیا۔

”یار! سنا ہے کہ تمہارا چچا مر گیا۔ اصل کانٹا تو وہی تھا تمہاری راہ کا... مقدمہ اب کون لڑے گا؟ تمہاری منگیتر تو لڑنے سے رہی؟“

”ہاں...! اب مقدمہ ختم ہو جائے گا۔“

”مبارک ہو۔“ کامران نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

تھوڑی دیر کے بعد کمال نے جیب سے ریوالور نکال کر اسے دکھایا۔ ”یہ کیا اصلی ہے؟“

”ہاں...!“ اس نے سر ہلایا۔ ”یار! یہ تو میں بھول گیا تھا۔ اچھا کیا تم لے آئے۔“

کامران نے اس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر جیب میں رکھا اور بولا۔ ”یار! یہ ایسا ٹرمپ کارڈ ہے جس سے میرا ہر داؤ کامیاب رہا۔ لڑکیاں ہر بات مان جاتی ہیں اور میں نے اس سے ہر طرح کی تصویریں بنائیں... ان سے ہر ماہ ہزاروں، لاکھوں کما رہا ہوں۔ میں نے دو دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے ہٹایا۔ پولیس آج تک ان کے قتل کا سراغ نہیں پاسکی اور میرا بال بیکا تک نہیں ہوا۔“ پھر اس نے تھوڑی دیر بعد گاڑی کو ایک ویرانے میں بنی کوٹھی کے گیٹ پر روک لیا۔ ”میں یہ ٹرمپ کارڈ لے کر جا رہا ہوں... دس منٹ میں دس لاکھ اور شراب کی بوتل لے کر آرہا ہوں۔ شراب کے بغیر حسن بے کیف ہوتا ہے۔“

کامران گیٹ کھول کر اندر چلا گیا۔ چھ سات منٹ بعد تجسس اسے اندر لے گیا۔ کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کامران کرسی پر بیٹھا شراب پی رہا تھا۔

ایک حسین عورت ہاتھ میں لفافہ لیے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”کامران! تم دس مہینے سے مجھے بلیک میل کررہے ہو... میں اپنی دس تصویروں کے نیگیٹوز کے دس لاکھ دے رہی ہوں لیکن تم یہ دس لاکھ نہیں لے جاسکو گے کیونکہ اب تم دس منٹ کے مہمان ہو۔“

”کیا مطلب...؟“ کامران بری طرح چونکا۔

”میں نے شراب میں زہر ملا دیا ہے اس لیے کہ تم نے میری زندگی بھی زہر ملا کر اجیرن کردی تھی۔“

اس عورت نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ کامران نے جیب سے ریوالور نکال کر اس کے سینے کو نشانہ بنایا۔ پے در پے تین فائر کیے۔ کامران اور عورت کو موت نے گلے لگا لیا۔

کمال نے باہر آکر گاڑی کی ڈکی سے اپنا سوٹ کیس نکالا اور ٹیکسی کی تلاش میں نکل گیا۔

☆...☆...☆

چھ مہینے بعد وہ لالہ رخ کے ساتھ صدر کی ایک دکان سے نکل رہا تھا جب ایک فیشن ایبل اور شوخ قسم کی لڑکی نے اس کا راستہ روک لیا۔

”بابر صاحب...! آپ نے مجھے پہچانا؟ کہاں ہیں آخر آپ؟“

کمال نے سنجیدگی سے کہا۔ ”معاف کیجیے گا محترمہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام کمال احمد ہے اور یہ ہیں میری بیگم لالہ رخ۔“

اس لڑکی نے حیرت سے سر ہلایا۔ ”کمال ہے... اتنی مشابہت بھی ہوتی ہے چہروں میں... آپ کے ایک بزنس پارٹنر تھے... کامران مرزا۔“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ لالہ رخ نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ ”یہ پہلے کرکٹ کھیلتے تھے۔ بزنس انہوں نے کبھی نہیں کیا۔ ہمارا ایک اسپتال ضرور ہے۔“

”کم آن ڈارلنگ! وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ چچی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

لالہ رخ ساڑی کا پلو سنبھال کے بیٹھ گئی۔ کمال نے دروازہ بند کیا اور گھوم کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے اس لڑکی کو دیکھا جو ابھی تک وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ کار روانہ ہوگئی۔

لالہ رخ زیرِ لب مسکراتی رہی۔ اس نے کمال کی ادائے ناشناسی کو پہچان لیا تھا مگر وہ مطمئن تھی۔ وہ سب چھوٹے اور بہت چھوٹے پتے تھے۔ وہ فیشن ایبل، بے باک اور جارحانہ انداز رکھنے والی لڑکیاں ہار گئی تھیں کیونکہ ایک خاموش محبت کے خلوص نیت کا ٹرمپ کارڈ اس کے پاس تھا... وہ کبھی نہیں ہار سکتی تھی۔

(ختم شد)